معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے — فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر (۲۵ / ۴۰)

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر (۹ / ۱۴)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۸ ماہ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۶ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۲-۸۴

مقالات

اسلام کے ابتدائی دور میں نوشت و خواند اور علم و تحفظِ کتب میں مسلمانوں کی جاں فشانی — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۵-۱۰۰

اندلس میں معاشرتی تنوع اور رواداری — جناب محمد احمد زبیری صاحب — ۱۰۱-۱۲۱

شبلی: شعر العجم اور خواجہ حافظ شیرازی — پروفیسر شعیب اعظمی — ۱۲۲-۱۳۵

ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' — جناب محمد عبد القدیر صاحب — ۱۳۶-۱۴۴

اخبار علمیہ — ک، ص اصلاحی — ۱۴۵-۱۴۷

وفیات

آہ! مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی — ''ض'' — ۱۴۸-۱۵۲

پروفیسر خورشید الاسلام — ''ض'' — ۱۵۳-۱۵۴

مولانا محمد عارف سنبھلی — ''ض'' — ۱۵۴-۱۵۵

مطبوعات جدیدہ — ع-ص — ۱۵۶-۱۶۰

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

۱۱؍جولائی کو ویسٹرن ریلوے کی لوکل ٹرینوں میں جو بھیانک بم دھماکے ہوئے ان کے ذکر سے ابھی تک اخبار خالی نہیں رہتے، اس میں دو سو آدمی ہلاک اور سات سو سے زیادہ زخمی ہوئے، جن بے رحم اور سنگ دل لوگوں نے پرامن ماحول کو شورش زدہ کیا ان کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے، یہ عبرت ناک سزاؤں کے مستحق ہیں تاکہ آیندہ وہ اس طرح کے اقدام کی جرأت نہ کریں، اسلام نے اسی لیے جرم اور شروفساد پر آمادہ لوگوں کی سخت سزائیں مقرر کی ہیں مگر متمدن لوگ ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں حالاں کہ پرامن نظام قائم کرنے اور فتنہ وشر کے انسداد کے لیے یہ سزائیں ناگزیر ہیں، اسی لیے قرآن مجید نے قصاص (بدلے) میں زندگی بتائی ہے اور کہا ہے کہ جس نے ناحق ایک آدمی کی جان لی اس نے گویا ساری نوع انسانی کی جان لی اور جس نے ایک آدمی کو بھی زندہ اور باقی رہنے دیا اس نے ساری انسانیت کو بچالیا، اس کی تعلیم یہ ہے کہ کسی پر ظلم وتعدی ہو تو سب کو بے چین و بے قرار ہوجانا اور مظلوم کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

یہ امر تو بدیہیات اور ہر قوم کے مسلمات میں شامل ہے اور اسلام نے خصوصیت کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے کہ بے قصور کو محض شک وشبہے کی بنا پر مورد الزام نہیں قرار دینا چاہیے، قرآن مجید کا فرمان ہے کہ "اڑتی پڑتی خبر سن کر کسی قوم پر پل نہ پڑو بلکہ اس کی اچھی طرح تحقیق وتفتیش کرلو" اگر چھان بین کے بعد واقعی کسی کے جرم کا پختہ ثبوت مل جائے تو خواہ وہ کسی نسل وخاندان اور فرقہ ومذہب کا ہو اور کتنا ہی برتر اور معزز ہو اسے معاف نہیں کیا جائے گا، انسانی گروہوں کی یہ عام کمزوری رہی ہے کہ وہ جرائم کی سزاؤں کے معاملے میں اپنے اور بیگانے میں فرق روا رکھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب یہ کیفیت سامنے آئی تو ارشاد ہوا کہ "اگر میری سب سے محبوب بیٹی فاطمہ بھی جرم کرے گی تو اسے سزا دی جائے گی"، بی جے پی نے اس کی روک تھام کے لیے پوٹا لگایا تھا اور اب یہ کہہ رہی ہے کہ اسے ختم کردینے کی وجہ سے دہشت گردی بڑھی ہے حالاں کہ اس کے دور میں سب سے زیادہ دہشت گردی ہوئی، ملک کا موجودہ قانون بھی اس سے نپٹنے کے

لیے کافی ہے بشرطیکہ قانون اور انصاف کی حکمرانی ہو جس کو بی جے پی کے دہرے معیار نے باقی نہیں رہنے دیا تھا، کہا جاتا ہے کہ پوٹا ایک خاص فرقے کو نشانہ بنانے کے لیے ہی لگایا گیا تھا۔

بی جے پی اور کانگریس یا این ڈی اے اور یوپی اے کی تخصیص نہیں، قریباً سب ہی کا مسلمہ خیال ہے کہ تشدد اور دہشت گردی کی واردات میں مسلمانوں کا ہاتھ ہوتا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی محرومی اور اپنے ساتھ ہونے والے دہرے معیار کی بنا پر جھنجھلاہٹ اور غصہ آجاتا ہے اور وہ بہت جلد مشتعل ہوکر تشدد پر آمادہ ہوجاتے ہیں لیکن ان کے غصہ واشتعال میں بھی عموماً دخل فرقہ پرست اور شرپسند لوگوں کی سازشوں کا ہوتا ہے، جن کا مقصد مسلمانوں کو مشتعل کرکے ماحول خراب کرنا اور فساد کرانا ہوتا ہے اور اب تو ایسے واقعات سامنے بھی آئے ہیں کہ سارا کھیل ان ہی شاطر لوگوں کا ہوتا ہے لیکن "بد اچھا بدنام برا" سارا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیا جاتا ہے، اس لیے حکومت کی ساری مشنری تحقیق وثبوت کے بغیر ان ہی کو اپنا ہدف بناتی ہے اور اصل مجرموں کا نام بھی نہیں آنے پاتا مزید برآں پریس، میڈیا اور سارے ذرائع ابلاغ مسلمانوں کو متہم کرکے پورے ملک میں ان کے خلاف نفرت کا ماحول گرم کردیتے ہیں، فسادات پھوٹ پڑتے ہیں، اندھا دھند ان کی گرفتاریاں ہونے لگتی ہیں، ان کے گھروں پر چھاپے مارے جاتے ہیں، جعلی اور فرضی مقدمات قائم کرکے انہیں تنگ اور پریشان کیا جاتا ہے اور ان کی تذلیل ورسوائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی، شرفا کی جان پر بن آتی ہے۔

ممبئی میں دھماکے ۱۱؍جولائی کو ہوئے، دوسرے دن وہاں ٹھیک ٹھاک رہا، روزمرہ کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں، لوگ اپنے کاموں میں لگ گئے لیکن جب شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف پھیر دی گئی تو فضا مسموم ہونے لگی اور مضحکہ خیز اور غیر ذمہ دارانہ قیاس آرائیاں اور بیان بازیاں ہونے لگیں حالاں کہ ابھی تک متعین طور پر کسی گروہ یا تنظیم کا نام سامنے نہیں آیا اور نہ کسی کی شناخت ہوسکی ہے، جس کو چاہا اذیتیں دینی شروع کردیں، اگر اس طرح کی حرکتوں میں واقعی مسلمان ملوث بھی ہوں گے تو ان کا کوئی ایک گروہ یا چند افراد ہوں گے مگر سارے مسلمانوں کو مورد الزام قرار دے کر انہیں ہراساں کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جاتی ہے، کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ واقعے کا دوسرا رخ بھی ہوسکتا ہے، ہندو انتہا پسند بھی تو مسلمانوں کو بدنام کرنے

کے لیے یہ سب کچھ کرسکتے ہیں، بعض اخباروں سے معلوم ہوا کہ دو کابینی وزیروں نے وزیر اعظم کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی تو ان کو ناگوار ہوا، کیوں کہ یہ طے کرلیا گیا ہے کہ مسلمان ہی یہ حرکتیں کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے کارروائیاں ہونے لگتی ہیں، کیا ایسے سخت اقدامات کے لیے محض قیاسات اور مفروضات کافی ہیں اور آزادانہ اور غیر جانب دارانہ تحقیقات ضروری نہیں ہیں، جب تشدد اور دہشت گردی معمول بنتی جارہی ہے تو حکومت، پولس اور خفیہ ایجنسیاں کیوں چوکنا نہیں رہتیں، آخر ان کی ناکامی، غفلت اور کوتاہی کی سزا مسلمان چاہے قصوروار نہ ہوں اور بے خطا ہوں کب تک بھگتیں گے۔

ممبئی بم دھماکوں میں محض شک وشبہہ کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ حکومت جو کارروائیاں کر رہی ہے ان سے بعض جگہ جارح ہندو قوم پرست تخریبی کارروائیاں کررہے ہیں، سورت کی ایک مسجد میں وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے کارکنوں نے توڑ پھوڑ کی، مائکروفون توڑا گیا اور موذن کو مارا پیٹا گیا، ان کا کہنا تھا کہ ممبئی ٹرین میں ان کے کئی آدمی مارے گئے، تری پورہ کے ڈی جی کا بیان ہے کہ تبلیغی جماعت کے ۴۰ لوگوں سے جو ممبرا کے تھے مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہے میں بہت تفصیل سے پوچھا گیا، یہ لوگ بے قصور ہیں اور ان کے خلاف کہیں کوئی مجرمانہ کیس درج نہیں ہے، مدھیہ پردیش میں ایس آئی ایم کے نام پر اندھا دھند گرفتاریاں ہونے لگیں، معلوم ہوتا ہے مہاراشٹر میں تو فساد کرانے کا منصوبہ ہی تھا، غالباً بھیونڈی کا تشدد اور مینا تائی کے مجسمے کی بے حرمتی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور گجرات کے وزیر اعلا گجرات کی کہانی مہاراشٹر میں دہرانے کے لیے ممبئی پہنچ گئے تھے، ممبئی کے اکثر مسلمان شک کے دائرے میں آگئے، خصوصاً اہل حدیث اور تبلیغ جیسی بے ضرر جماعتیں اور انصاری لاحقے کے لوگ، سب سے شرم ناک واقعہ ممبئی ایرپورٹ پر ریحان احمد اور ان کی فیملی کا ہے جو ممبئی دھماکے میں ہلاک ہونے والے اپنے بڑے بھائی اعجاز احمد کی تجہیز وتدفین میں شریک ہونے کے لیے روس سے آئے تھے، ان سے پندرہ گھنٹے تک ایک ہی طرح کے سوالات کیے گئے جن میں ایک یہ تھا کہ داڑھی کیوں رکھتے ہو، طویل تفتیش کے درمیان انہیں، ان کی بیوی اور خورد سال بچے اور بچی کو کھانے پینے کا کوئی موقع نہیں دیا، اس سے ان کی بیوی بہت دہل گئیں اور بول پڑیں کہ "اپنی زندگی میں اتنی ذلت اور بے بسی محسوس نہیں کی تھی"۔

☆☆☆☆☆

مقالات

اسلام کے ابتدائی دور میں نوشت وخواند
اور
علم وتحفظ کتب میں مسلمانوں کی جاں فشانی

از:- ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن مجید کی طرح حدیثیں بھی مدون ہونے لگی تھیں اور ان کے حسب ذیل تحریری سرمایے مرتب ہوگئے تھے جو مخطوطے کی صورت میں تھے۔

۱- جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ یا حضرت علیؓ وحضرت انسؓ وغیرہ نے قلم بند کیں۔

۲- تحریری احکام اور معاہدات اور وہ فرامین جو رسول اللہ ﷺ نے قبائل کے معلمین، قضات، محصلین اور گورنروں وغیرہ کو بھیجے۔

۳- خطوط جو آپ ﷺ نے سلاطین وامرا کے نام بھیجے۔

۴- پندرہ سو صحابہ کے نام مردم شماری کے لیے لکھوائے۔

۵- خطوط پر ثبت کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ نے اپنی ایک مہر بھی تیار کرائی تھی، جس وقت آپ ﷺ نے شاہ روم یا اہل عجم کو خطوط بھیجنے کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ لوگ مہر شدہ مکتوب ہی پڑھتے ہیں (گویا اسی کو معتبر سمجھتے ہیں) چنانچہ آپ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا، آپ ﷺ کی وفات کے بعد وہ

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ کے پاس تھی کہ ایک روز ان سے کنوئیں میں گر گئی۔(۱) حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت عثمانؓ آریس کنوئیں پر بیٹھ کر انگوٹھی کبھی پہنتے تھے اور کبھی نکال دیتے تھے، اسی میں وہ اس کنوئیں کے اندر گر گئی، پھر ہم لوگ تین روز تک اسے ڈھونڈتے رہے، حضرت عثمانؓ نے کنوئیں کا سارا پانی بھی نکلوا دیا مگر وہ نہیں ملی، روایت میں اس کا ذکر بھی ہے کہ انگوٹھی کا نقش تین سطروں میں تھا، ایک میں محمدؐ دوسری میں رسول اور تیسری میں اللہ لکھا ہوا تھا۔(۲)

عہد صحابہ میں احادیث کی کتابت اور اس کے تحریری مجموعے

دستاویزوں اور تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز تو دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا، عہد صحابہ میں ان کے مجموعے لوگوں کے پاس رہتے تھے، مشہور فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے ان سب کو یکجا کر کے ''الوثائق السیاسیة فی العہد النبوی والخلافة الراشدة'' مرتب کی تھی جو مصر سے شائع ہوئی، اس میں خاص عہد نبوی کی دوسو دستاویزیں درج ہیں، بعد کے اڈیشن میں اس تعداد میں اور اضافہ کیا گیا تھا۔(۳)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے جمع کردہ ذخیرۂ احادیث ''الصحیفة الصادقة'' میں ایک ہزار حدیثیں تھیں، یہ نسخہ ان کے خاندان میں عرصے تک رہا، ان کے پوتے عمرو بن شعیب اسی کو سامنے رکھ کر حدیثیں بیان کرتے اور درس دیتے تھے، امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں اس کو مدغم کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔(۴)

حضرت علیؓ کے پاس جو صحیفہ تھا اس میں خوں بہا اور قیدیوں کی رہائی کے علاوہ یہ درج تھا کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے باعث قتل نہیں کیا جائے گا(۵)، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم باب مایذکر فی المناولة، ج۱، ص۱۵ و کتاب اللباس باب خاتم الفضة و باب نقش الخاتم ج۲، ص۸۷۲ و ۸۷۳ و صحیح مسلم کتاب اللباس والزینة باب لبس النبی ﷺ خاتما من ورق، ج۲، ص۲۱۴ و فتوح البلدان بلاذری، ص۴۶۷، مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ھ (۲) صحیح بخاری کتاب اللباس باب ہل یجعل نقش الخاتم ثلاثة اسطر، ج۲، ص۸۷۳ (۳) ڈاکٹر محمد حمید اللہ: صحیفہ ہمام بن منبہ، ص۲۳ (۴) ایضاً، ص۲۶ (۵) صحیح بخاری کتاب العلم باب کتابة العلم، ج۱، ص۲۱۔

کہ اس میں زخم کے بھرنے اور (بہ غرض زکوٰۃ) اونٹوں کی عمریں بھی درج تھیں۔(۱)

مروان بن حکم مدینہ کے گورنر نے ایک روز حضرت ابوہریرہؓ کو بلوایا اور پردے کے پیچھے ایک کاتب کو بٹھا دیا، مروان ان سے حدیثیں پوچھتا تھا، کاتب ابوہریرہؓ کی لاعلمی کی حالت میں ان کی ہر بیان کردہ حدیث کو لکھتا جارہا تھا، اس طرح بہت سی حدیثیں ہوگئیں، ایک سال بعد پھر مروان نے انہیں بلایا اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر پہلے کی تحریر کردہ حدیثوں کا مقابلہ کرتا جاتا تھا جس میں نہ کہیں ایک حرف زیادہ تھا اور نہ کم، اس مسند ابی ہریرہ کے نسخے عہد صحابہ میں لکھے گئے اور عمرؒ بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر (م۸۶ھ) کے پاس بھی اس کا نسخہ تھا، حضرت ابوہریرہؓ کی ایک اور کتاب ان کے شاگرد بشیر بن نہیک نے مرتب کی تھی۔(۲)

ہمام بن منبہ (م۱۰۱ھ) بھی حضرت ابوہریرہؓ کے ایک شاگرد تھے، دونوں بزرگ یمن کے تھے، صحیفہ ہمام بن منبہ حضرت ابوہریرہؓ سے ہمام بن منبہ کی روایت کردہ احادیث کا مجموعہ ہے جو بعینہ محفوظ رہا اور تاحال دست یاب شدہ کتب حدیث میں قدیم ترین ہے کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی تھی، بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام الصحیفة الصحیحة تھا، یہ صحیفہ بھی مسند احمد بن حنبل کا جزء ہو چکا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق بہت سے معلومات فراہم کیے ہیں، انہیں اس کے نسخے دمشق اور برلین میں ملے تھے جس میں ۱۳۸ حدیثیں ہیں جس کا عربی متن المجمع العلمی العربی دمشق کے تین شماروں میں ۱۹۵۳ء میں شائع کیا اور اس سے قبل اس کے کئی اڈیشن حیدرآباد سے طبع کرائے تھے جس میں حدیثوں کے متن کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی شامل ہے، دونوں نسخوں میں تدوین حدیث سے متعلق بہت سی قیمتی معلومات شامل ہیں۔

مولانا شبلیؒ رسول اللہ ﷺ کے بعد کے تحریری ذخیرے کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ کے بعد اس تحریری ذخیرے کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ بنو العباس سے پہلے ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایات کا

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد باب ذمة المسلمین و جوارہم واحدة۔ ج۱، ص۴۵۰ (۲) صحیفہ ہمام بن منبہ (دیباچہ، ص۴۵ و ۴۶)۔

دفتر ولید کے کتب خانے سے منتقل ہوا تو صرف امام زہریؒ کی مرویات اور تالیفات
گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں"۔(۱)

مولانا شبلی کا خیال ہے کہ اسلام کے عہد میں زبانی روایتوں کا ذخیرہ ابتدا ہی میں پیدا ہوگیا تھا لیکن چوں کہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ عموماً ایک مدت کے بعد قائم ہوا، اس لیے کوئی خاص کتاب اس فن میں نہیں لکھی گئی لیکن جب تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلی کتاب جو لکھی گئی تاریخ کے فن میں تھی۔

حضرت امیر معاویہؓ (م ۶۰ھ) کے زمانے میں عبید بن شریہ ایک شخص تھا جس نے جاہلیت کا زمانہ دیکھا تھا اور اس کو عرب و عجم کے اکثر معرکے یاد تھے، امیر معاویہؓ نے اس کو صنعا سے بلایا اور کاتب اور محرر متعین کیے کہ جو کچھ وہ بیان کرتا جائے، اس کو قلم بند کرتے جائیں، علامہ ابن ندیم نے اس کی متعدد تالیفات کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک کتاب کا نام "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" ہے، غالباً یہ وہی کتاب ہے۔(۲)

گو قرآن مجید کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب موطا امام مالک (م ۱۷۹ھ) ہے مگر اس سے پہلے نہ صرف حدیث بلکہ سیر کے مجموعے بھی پہلی صدی ہجری میں مرتب ہوگئے تھے جو ناپید تھے مگر اب مل رہے ہیں اور جوں جوں تمدن ترقی کرتا گیا تصنیف و تالیف کا رواج بھی بڑھتا گیا، عباسی دور میں یونانی علوم کی کتابوں کے بہ کثرت ترجمے عربی زبان میں ہوئے لیکن ایک عرصے تک تالیف و ترجمہ کا کام ہاتھ ہی کا نوشتہ ہوتا تھا۔

کتابوں اور مخطوطات کا تحفظ

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں مخطوطہ نگاری کے فن کو اس قدر ترقی دی کہ اس کی بہ دولت خطاطی کا فن وجود میں آیا اور ہر قسم کے بیل بوٹوں اور نقش نگاری سے اس کی تزئین کی، انہوں نے مخطوطات اور قلمی کتابوں کا جو ذخیرہ یادگار چھوڑا، اس کے تحفظ سے بھی غافل نہیں رہے بلکہ اس کی حفاظت کا پورا ساز و سامان کیا، بوسیدگی اور کرم خوردگی سے محفوظ رہنے والے عمدہ کاغذ استعمال کیا، پختہ دیرپا اور موسمی اثرات سے پاک رہنے والی سیاہی تیار کی،

(۱) سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۱۶، بحوالہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی تذکرہ امام زہری (۲) الفاروق حصہ اول، تمہید ص ۳، مطبوعہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء، بحوالہ الفہرست ص ۱۳۲۔

قلمی نسخوں کی جلدیں مضبوط چمڑے یا اژدہوں اور سانپوں کی کھالوں سے بندھوائی، کتابوں کی حفاظت کے لیے کتب خانے قائم کیے، اکثر مصنفین اپنے نسخے اپنے پاس رکھنے کے بجائے شاہی سرپرستی میں دیکھ بھال ہونے والے کتب خانوں میں داخل کردیتے تھے تاکہ وہ دست برد سے محفوظ رہیں اور زیادہ لوگ ان سے مستفید ہوسکیں، دیمک سے محفوظ رہنے والی خاص قسم کی الماریاں بنوائیں، ایک ایک مخطوطہ کی کئی کئی نقلیں تیار کراکے مختلف جگہوں پر بھجوائے تاکہ اس خزانے سے دوسرے لوگ بھی فیض یاب ہوں اور آنے والی نسلیں بھی اس دولت سے محروم نہ رہیں۔(۱)

کتب خانوں کی بربادی

لیکن جب مسلمانوں کے تنزل کا دور آیا اور مسلمانوں کی حکومتیں داخلی عدم استحکام اور سیاسی انتشار کا شکار ہوئیں تو ان کی علمی ترقی رک گئی، ان کے علمی زوال سے ان کے علمی مراکز برباد ہونے لگے، کتب خانے ویران ہوگئے، مخطوطات کی ناقدری اور ان کی جانب سے غفلت اور تساہل ہونے لگا اور وہ بیرونی حملوں کا نشانہ بھی بن گئے، نادر اور قیمتی ذخیرے نسیاً منسیاً ہوگئے، اس طرح کے متعدد واقعات تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں، شورشِ تاتار کے زمانے میں عباسی دور کے بیت الحکمت کا سارا علمی ذخیرہ دریائے دجلہ میں بہادیا گیا جس کی وجہ سے کئی روز تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ رہا۔(۲)

طوائف الملوکی کے دور میں عیسائیوں نے اندلس میں کتابوں کے انبار میں آگ لگادی، صلیبیوں نے شام میں مکتبہ بنی عمار کے ہزاروں مخطوطات تباہ کرڈالے، ۴۶۱ھ میں مصر میں قحط پڑا تو عوامی بغاوت نے محل پر دھاوا بول کر ہزاروں کتابیں پھاڑ ڈالیں اور ان کی چرمی جلدوں کے جوتے بنالیے، شیعہ سنی اختلافات کے زمانے میں فاطمیوں کے مکتبات جلادیے۔(۳)

اس قدر افسوس ناک حالات میں بھی جو لوگ علم و فن کے صحیح معنوں میں قدرداں اور صاحب ذوق تھے، ان کے شوق و ذوق میں کمی نہیں آئی اور نہ ان کے حوصلے پست ہوئے، یہ علمی اشغال میں منہمک رہے اور کتابوں کے خطی نسخے بھی تیار ہوتے رہے، جن کے تحفظ و بقا اور تحقیق و تدقیق کو وہ اپنا قومی، ملی اور دینی فریضہ سمجھتے رہے، مگر یورپ کے عالم گیر سیاسی تسلط کے بعد جب علم

(۱) فکر و نظر، اسلام آباد، خصوصی اشاعت "مخطوطات نمبر" اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۷ء، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۶۶ (۲) ایضاً ص ۶۷ (۳) ایضاً۔

وفن اور حکمت و دانش کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھ میں چلی گئی تو انگریزوں کا جہاں جہاں قبضہ ہوا، وہاں کے علمی ذخائر یورپ میں منتقل کردیے، اس طرح مسلمانوں کی بہت سی بیش قیمت اور نادر و نایاب کتابیں یورپ پہنچ گئیں، اسی لیے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

اسلامی لٹریچر کے ساتھ یورپ کا متعصبانہ رویہ

یہ یورپ کا کارنامہ ضرور ہے کہ اس نے مشرقی اور اسلامی دنیا کے قیمتی سرمایے کو شائع کرکے از سر نو زندہ کیا اور باوجود اس کے کہ انہیں اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، مسلمانوں کے علوم وفنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح و تحشیہ میں بڑی جاں فشانیاں کیں، مارگولیتھ نے مسند احمد بن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا جس کی توفیق اکثر مسلمانوں کو بھی نہیں ہوئی ہوگی، یورپ نے جس اعلا معیار پر مسلمانوں کی کتابوں کو تحقیق و محنت سے ایڈٹ کیا ہے، اس کے لیے مسلمانوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیے، اس کی بنا پر بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے علم دوستی اور بے تعصبی کی وجہ سے کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اولاً تو یہ علوم وفنون ان کے اپنے نہیں تھے، اس لیے ان سے ان کی واقفیت اس درجہ کی نہیں تھی جس درجہ کی واقفیت مسلمان علما و محققین کی ہوتی ہے، ثانیاً ان کو اسلامی علوم سے وہ ہمدردی بھی نہیں ہوسکتی جو مسلمانوں کو ہے، اس بنا پر ان سے بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں نادانستہ ہوگئی ہیں، علاوہ ازیں اکثر یورپین مصنفین و محققین غیر جانب دار اور حق شناس نہیں تھے، وہ متعصب اور نکتہ چیں تھے، تحقیق و تنقیح کا مقصد حق کو آشکارا کرنا ہے مگر انہوں نے حقائق کا انکشاف کرنے کے بجائے کتمان حق، تلبیس، تدلیس اور فریب دہی سے کام لیا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھنے اور ان کے علوم کو سیکھنے کا کام ہی اس لیے کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے علوم، تاریخ، تمدن، قرآن مجید اور آنحضرت ﷺ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنائیں تاکہ مسلمانوں کو گمراہ اور اپنے علوم و معارف سے بے گانہ کردیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہ اعتراضات، نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی میں نہیں بعض محققین اور علمائے اسلام میں بھی سرایت کر گئے۔

ہمارے جو خزانے وہ منظر عام پر لائے ہیں، ان میں اور اپنی تصنیفات میں بھی انہوں

نے واقعات کو نیا رنگ دے کر ان کا اصل رنگ غائب کردیا، جس حقیقت کو چاہا افسانہ اور جس افسانے کو چاہا اپنی رنگ آمیزی سے حقیقت بنادیا اور اصلیت کو جھوٹ اور فریب بنادیا، وہی مارگولیتھ جس نے مسند احمد کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا تھا، جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری لکھتا ہے تو بہ قول مولانا شبلی ''دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال پیش نہیں کرسکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنادیتا ہے''۔(۱)

اس غلط کاری کی اصلی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، جس کی علم و تحقیق کی دنیا میں کوئی گنجائش نہیں، گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے شعبہ عربی کے استاذ ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم نے لکھا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے پس پردہ یہ مقاصد ہوں:

۱- مسلمانوں کا رابطہ ان کے ماضی سے منقطع ہوجائے اور وہ اپنے آبا و اجداد کی میراث سے دور رہیں اور ان کے حصول کے لیے انہیں اہل یورپ کا دست نگر ہونا پڑے۔

۲- منتخب مخطوطوں کو Edit کرکے مسلمانوں پر اپنی علمی برتری کا اظہار۔

۳- مسلمانوں کو اپنے ہی علمی ورثے سے اس طرح دور رکھنا کہ نہ وہ اپنے علما کی تحقیق اور اکتشافات علمی سے آگاہ ہوسکیں اور نہ اہل یورپ کے انہیں اپنے علما کی طرف منسوب کرنے کے دعووں کا پول کھل سکے۔(۲)

یورپ کے متعصبانہ رویہ کے نقصانات

طوالت مانع ہے ورنہ ہم یورپ کے سیاسی و مذہبی تعصب سے جو گم راہیاں اور غلط فہمیاں پھیلی ہیں، ان کی متعدد مثالیں پیش کرتے مگر یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

مصر کے طٰہٰ حسین عربی زبان و ادب کے بہت ممتاز اہل قلم ہیں، وہ فرانس سے تعلیم حاصل کرچکے تو قاہرہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہوئے، انہوں نے تعلیم و تدریس کے قدیم نہج میں تبدیلیاں کیں اور لکچر کا طرز اختیار کیا، یونی ورسٹی میں وہ جاہلی ادب کی تعلیم و تدریس پر مامور تھے،

(۱) مقدمہ سیرۃ النبی، ص ۹۶ (۲) فکر و نظر، ص ۶۷ و ۶۸۔

طلبہ کو ان کا لکچر بہت پسند آتا تھا اور وہ نوجوانوں کے دلوں کو موہ لیتا تھا مگر یورپ کے زیر اثر آہستہ آہستہ انہوں نے جاہلی دور کی شاعری ہی کا انکار کردیا اور اپنے طلبہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھا دینی چاہی کہ جاہلی دور کا شعر و ادب افسانہ ہے، نہ اس کا کوئی وجود ہے اور نہ حقیقت۔

جاہلی دور کی شاعری کا جو سرمایہ دست برد سے محفوظ ہے، اس میں الحاقی اور منحول کلام ضرور شامل ہوگیا ہے مگر زمانہ جاہلیت کے تمام سرمایہ شعر و ادب کو بے حقیقت قرار دینا مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گم راہی ہے جس کی نشان دہی مصر کے مشہور فاضل و محقق احمد تیمور نے کی کہ سب سے پہلے مارگولیتھ نے اس پر مضمون لکھا تھا جس کو پڑھ کر ادب کا شاہ فیصل ایوارڈ پانے والے علامہ محمود شاکر بہت برہم ہوئے، وہ اس وقت یونی ورسٹی کے طالب علم اور طٰہٰ حسین کے زیر درس تھے، کلاس ہی میں انہوں نے طٰہٰ حسین کی مخالفت کی اور یہ کہہ کر یونی ورسٹی کی تعلیم چھوڑ دی کہ جس یونی ورسٹی میں اچھی بات بتانے کے بجائے یہ گم راہ کن باتیں سکھائی جائیں اس سے کیا فائدہ؟ اس کے بعد وہ عرصے تک بڑی کشمکش میں رہے، پھر انہیں خیال ہوا کہ اس کی اصل حقیقت کا پتا لگانا چاہیے، اس کے لیے انہوں نے جاہلی دور کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا۔

چنانچہ وہ دس سال تک مسلسل اس دور کی شاعری کا مطالعہ کرتے رہے اور شعرا کے مکمل نامکمل، مطبوعہ مخطوطہ دواوین کی تلاش و جستجو کرتے رہے، نامکمل دواوین کو ادب، تاریخ اور تراجم کی کتابوں کی چھان بین کرکے مکمل و مرتب کیا، اس طویل مشقت و ریاضت سے وہ اس عہد کی شاعری سے پوری طرح مانوس ہوگئے اور جب انہیں اس سے پورا ربط و مناسبت پیدا ہوگئی تب جاکر ان پر بہت سے حقائق منکشف ہوئے اور وہ مستشرقین کا یہ منشا سمجھنے میں کامیاب ہوئے کہ وہ دراصل قرآن مجید کی زبان و اسلوب کو نظر انداز کرنے اور کم تر ثابت کرنے کے لیے ایک حقیقت ثابتہ کو افسانہ بنانے کے درپے ہوئے ہیں، علامہ محمود شاکر کا خیال ہے کہ جب تک جاہلی دور کی شاعری کی حقیقت، اس سے ربط و تعلق اور اس میں مہارت و کمال حاصل نہ ہوگا اس وقت تک قرآن مجید کا اعجاز سمجھ میں نہیں آئے گا، مستشرقین نے قرآن مجید پر سے مسلمانوں کا اعتماد ختم کرنے کے لیے یہ افسانہ گڑھا ہے ورنہ جاہلی دور کا ادب و شاعری ایک لحاظ سے کلام مجید کا محافظ

اور دوسرے اعتبار سے اس کی تہوں تک پہنچنے میں معاون و مددگار ہے۔(۱)

ادب کا شاہ فیصل ایوارڈ پانے والے ان ہی علامہ محمود شاکر کا یہ واقعہ بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ ۱۹۳۶ء میں المقتطف کے اڈیٹر نے ان سے عربی کے مشہور شاعر متنبی کے ایک ہزار سالہ جشن کے موقع پر اپنے رسالے کے خاص نمبر کے لیے متنبی پر ایک مضمون کی فرمائش کی، اس کے سوانح نگاروں اور محققین و ناقدین کی رائیں اس کے بارے میں بہت مختلف ہیں، اس کی وجہ سے اس کی زندگی اور شاعری ایک معما بن گئی ہے، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ متکبر، بدمزاج، بدکردار، بداخلاق، مجہول النسب، اعلا اوصاف و محامد سے عاری تھا، سلاطین و امرا کی مداحی اس کا پیشہ تھا، دولت کا حریص تھا اور اس کی شاعری تملق اور چاپلوسی کا نمونہ ہے۔

علامہ محمود شاکر نے متنبی کی صحیح تصویر سامنے لانے کے لیے کمر کسی اور اس کا مطالعہ شروع کیا، ان کا نظریہ یہ تھا کہ کسی شاعر پر لکھنے کے لیے اس کے سارے دواوین کے تمام نسخوں کا گہرا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور مطالعہ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ لکھنے والا شاعر کے فکر و فن اور اس کے جذبات و خیالات میں غوطہ زن ہوجائے اور اسے یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ بھی اس فن کا حصہ ہے، اس کے عہد و ماحول سے بھی مکمل واقفیت ہونی چاہیے کہ وہ کس زمانے میں پیدا ہوا، کس دور میں اس کی شاعری پروان چڑھی، مراحل زندگی میں وہ کن حوادث کا شکار ہوا، کن لوگوں نے اس کو محبت کی نظر سے دیکھا اور کون اسے نیچا دکھانے میں لگے رہے، کون لوگ اس کی جان لینے کے درپے اور خون کے پیاسے تھے، علامہ نے متنبی کے دواوین ہی کے مطالعہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کی شروح بھی دیکھیں اور متنبی کے زمانے اور بعد کی تاریخوں، سوانح اور کتب تراجم بھی کھنگالی، اگر انہیں متنبی کے بارے میں ایک سطر اور ایک حرف بھی کہیں مل جاتا تو وہ اسے سینے سے لگا لیتے، ان کا بیان ہے کہ اس طویل مطالعہ سے بہت سی گتھیاں خود بہ خود کھلنے لگیں اور اس کے مخالفین و معاندین نے اس پر جو تہمتیں عائد کی تھیں وہ اپنے آپ چھٹنے لگیں اور متنبی کی اصلی تصویر یہ سامنے آئی کہ وہ غیور، خوددار اور باحمیت شاعر تھا۔

علامہ محمود شاکر کا یہ مقالہ ۱۷۰ صفحات پر مشتمل اور بہت جان دار اور تحقیقی و تنقیدی لحاظ

(۱) معارف، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۵، مضمون پروفیسر محمد راشد ندوی۔

سے انوکھا اور نرالا تھا۔

المتنبی کے نمبر کے لیے متنبی پر جو مضامین آئے تھے ان کو نہ شائع کر کے صرف یہی اس کی زینت بنا اور عرب کے ادبا اور محققوں نے اسے فکر وفن، زبان و بیان اور تحقیق وتنقید کا اعلا نمونہ قرار دیا، اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، ڈاکٹر طہ حسین اور عقاد تک نے انہیں داد دی اور واقعی وہ داد و تحسین کا مستحق ہے، پروفیسر راشد ندوی لکھتے ہیں:

> "اسے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف شاعر کی پیدائش سے لے کر شہادت تک ایک ایک لمحہ اس کے ساتھ رہے اور شاعر اپنی زندگی میں جن آلام و مصائب سے دوچار ہوا، اس کے ذہن وقلب پر جو اثرات مرتب ہوئے اور قلق والم کے جو لمحات اس نے کاٹے جس کی جھلک اس کی شاعری کے ایک ایک لفظ سے مترشح ہوتی ہے، مصنف ان آلام و مصائب کو دیکھ کر شاعر کی ان کیفیات کو بھی محسوس کرتا ہے اور جس انداز میں ان کو ترتیب دیتا ہے، پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ خود شاعر اپنی کہانی اپنی زبانی مصنف کو سنا رہا ہے اور وہ اس کو اپنے انداز میں پیش کر رہا ہے"۔(۱)

دراصل متنبی اپنے زمانے میں عربی کا سب سے بڑا شاعر تھا، جس کی نظروں کے سامنے عرب ملکوں کی تباہی اور عربوں کی بے کسی پوری طرح جلوہ گر تھی، وہ دیکھ رہا تھا کہ عباسی خلفا کی کمزوری سے حکومت کے ہر شعبہ پر عجمیوں کا غلبہ وتسلط ہو گیا تھا، یہ اس کی زندگی کا کرب اور بے چینی تھی، وہ عربوں اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانا چاہتا تھا اور عربی زبان و ثقافت جو زوال پذیر ہو رہی تھی، اس کا احیا کرنا چاہتا تھا، اس لیے لوگ اس کے مخالف ہو گئے اسے بدنام اور مجروح کرنے میں مستشرقین کی ملمع کاری نے اپنا ہاتھ دکھایا۔

بحر علم میں غواصی اور تحقیق و تدقیق میں محنت و جاں فشانی کی گوناگوں مثالیں قدما کے یہاں ملتی ہیں مگر ہم نے عہد حاضر کے ایک ممتاز عالم و محقق کی یہ دو مثالیں پیش کی ہیں جو کافی ہیں۔

مسلمانوں کا علمی تعصب اور تحقیق سے ان کی بے پروائی کے نقصانات

مگر علمی تنزل کے دور میں

(۱) معارف، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۷۔

مسلمانوں میں بھی تعصب آگیا تھا اور اس سے متاثر ہو کر انہوں نے واقعات وحقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، ان کے تعصب کا نشانہ ان کے حریف عیسائی تھے اور انہیں اس کا احساس نہ ہوا کہ ان کے اس مذہبی تعصب کی زد خود ان کے ہیرو پر پڑ رہی ہے، مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:

> "آج جس قدر تاریخیں متداول ہیں ان میں غیر قوموں کی نسبت حضرت عمرؓ کے نہایت سخت احکام منقول ہیں لیکن جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ یہ اس زمانے کی تصنیفات ہیں جب اسلامی گروہ میں تعصب کا مذاق پیدا ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ قدیم زمانے کی تصنیفات پر نظر ڈالی جائے جن میں اس قسم کے واقعات بالکل نہیں یا بہت کم ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر تعصب آتا گیا ہے اسی قدر روایتیں خود بہ خود تعصب کے سانچے میں ڈھلتی گئی ہیں، تمام تاریخوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ عیسائی کسی وقت اور کبھی ناقوس نہ بجانے پائیں لیکن قدیم کتابوں کتاب الخراج اور تاریخ طبری وغیرہ میں یہ روایت اس قید کے ساتھ منقول ہے کہ "جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہوں اس وقت عیسائی ناقوس نہ بجائیں"۔

ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ قبیلہ تغلب کے عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دینے پائیں لیکن یہی روایت تاریخ طبری میں ان الفاظ سے مذکور ہے کہ "جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کے بچوں کو زبردستی اصطباغ نہ دیا جائے"۔(۱)

ذیل میں افسانوں کو حقائق بنانے کی کچھ مثالیں مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کی نسبت سے تحریر کی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ علم و تحقیق کے میدان میں حقیقت نگاری سے کام نہ لینے سے کسی کتنی خرابی اور گمراہی پھیلتی ہے۔

محدثین کے یہاں روایتوں کے رد و قبول کے بڑے سخت اصول ہیں مگر انہوں نے تحقیق وتنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی ہے کیوں کہ ان سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت وفضائل وغیرہ سے متعلق ہیں ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں

(۱) الفاروق دیباچہ حصہ اول، ص ۱۵، مطبوعہ ۱۹۵۶ء۔

حاجت نہیں سمجھتے، یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئی ہیں اور بڑے بڑے علما نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کو درج کرنا جائز رکھا، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفا اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال وحرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔(۱)

خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے معجزات کے متعلق جھوٹی اور بے سروپا روایتیں مسلمانوں میں بہت مشہور ہوگئی ہیں، یہ روایتیں زیادہ تر کتب دلائل میں ہیں جو معجزات ہی کی روایتوں کے لیے مختص ہیں، ان کی وجہ سے جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگ گیا ہے اور ان ہی سے میلاد و فضائل کی تمام کتابوں کا سرمایہ مہیا کیا گیا ہے، خوش اعتقادی اور عجائب پرستی نے ان غلط معجزات کو اس قدر شرف قبول بخشا کہ ان کے پردے میں آپ ﷺ کے تمام صحیح معجزات چھپ کر رہ گئے اور حق و باطل کی تمیز مشکل ہوگئی، اس ذخیرے سے کتب صحاح خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں لیکن تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ اس درجہ بے احتیاطی سے لکھی گئیں کہ محدثین ثقات نے ان کو بیش تر ناقابل اعتبار قرار دیا، کتب دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا تاکہ ختم المرسلین ﷺ کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہو سکے، اس کی متعدد مثالیں سیرۃ النبی جلد سوم میں موجود ہیں، ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہے اور وجہ وہی بتائی گئی ہے کہ ان روایات کی جانچ اور تنقید میں جن کا تعلق احکام فقہی سے ہے، محدثین نے جو سختی اور شدت اختیار کی ہے وہ مناقب اور فضائل کے باب میں نہیں کی ہے، چنانچہ علم حدیث کے بڑے بڑے اماموں نے علانیہ اس کا اعتراف کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی کے الگ الگ فضائل، نام بہ نام تمام خلفا کے مناقب، مقامات اور شہروں کے محامد،

(۱) سیرۃ النبی، ج ۱، مقدمہ ص ۵۳ تا ۷۳، جدید اڈیشن۔

اعمال انسانی کے مبالغہ آمیز ثواب وعقاب کے بیانات، آنحضرت ﷺ کے متعلق کاہنین عرب کی پیشین گوئیاں اور اشعار اور عجیب وغریب غیر صحیح فضائل، معجزات اور برکات وغیرہ کا یہ بے پایاں دفتر روایات میں موجود اور کتابوں میں مدون ہے جو واعظوں اور میلاد خوانوں کا سرمایہ اور گرمی محفل کا سامان ہے۔(۱)

اب ہم اردو شاعری کی بہت مقبول صنف مرثیہ گوئی کے تعلق سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، شاعری کی اصل بنیاد قوت تخییل اور جذبات نگاری پر رکھی گئی ہے، اس لیے شاعری کی اکثر اصناف تاریخی شواہد اور مواد سے خالی ہیں مگر مرثیہ اس سے مستثنیٰ ہے، اس کی بنیاد کربلا کے مہتم بالشان تاریخی واقعہ پر ہے، اس میں روایات کو نظم کرنے کا التزام ملتا ہے، مرزا دبیر کے یہاں روایتوں سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے کیوں کہ وہ عالم، دین دار اور درسیات کے فاضل تھے مگر واقعہ بہر حال ایک ہی ہے جس پر طبع آزمائی کی گئی ہے، اس لیے میر انیس مرحوم کے بہ قول ع

اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں۔

مرزا صاحب کے اکثر بہترین مرثیے وہی سمجھے جاتے ہیں جن میں خرق عادت باتیں اور وضعی روایتیں ہیں، اس کی وجہ سے دین دار، ضعیف الاعتقاد اور روایت پرستوں میں وہ بہت مقبول اور عامیانہ ذوق رکھنے والوں، توہم پرستوں اور عزاداروں کے لیے وہ نہایت پرکشش ہوئے، مگر مرثیے کی روایات عموماً ساقط الاعتبار ہوتی ہیں، عام مرثیہ گویوں اور خود مرزا صاحب نے بھی ہر قسم کی رطب ویابس روایات نقل کی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ شاعری میں یہ سب روا ہے لیکن معاملہ صرف شاعری کا نہیں ہے بلکہ مرثیہ کا تعلق مذہب سے جوڑ دینے کی وجہ سے اسے تقدس کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، اس لیے اس کے تعلق سے جو بات بیان کی جائے اسے معتبر ہونا چاہیے، مثال کے طور پر صرف شیریں سے متعلق مرثیے کو یہاں زیر بحث لایا جاتا ہے۔

حضرت امام حسینؓ کی زوجہ حضرت شہر بانو کے ساتھ ان کی کنیز شیریں بھی آپ کے خانہ اقدس میں آئی تھی، آپ نے اسے اپنے گھر والوں کی طرح رکھا اور اس سے بڑا اچھا سلوک کیا، اسے بھی امام عالی مقام سے والہانہ عقیدت تھی اور آپ پر اور آپ کے گھر والوں پر اپنی جان

(۱) سیرۃ النبی، ج ۳، ص ۹۸ و ۹۹ ملخصاً، طبع جدید ۲۰۰۳ء۔

چھڑ کی تھی، جناب امام نے اسے آزاد کر دیا اور اسے رخصت کرنے دور تک تشریف لے گئے، اس نے آپ سے اپنی مہمانی قبول فرمانے کا وعدہ لیا، شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک پہاڑ پر واقع قلعہ شیریں میں رہتی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ بڑے آرام اور فراغت کی زندگی گزار رہی تھی۔

امام حسینؓ کی شہادت کے بعد کربلا کے مسافروں کے لٹے ہوئے قافلے کو لے کر جب یزیدی فوج شام کی طرف روانہ ہوئی اور اس کی خبر شیریں کو پہنچی جس کا قلعہ اسی راستے میں پڑتا تھا تو وہ جوش مسرت سے جھوم اٹھی اور سمجھی کہ امام عالی مقام مجھے میزبانی کا شرف بخشیں گے، چنانچہ وہ ان کی اور رفقائے سفر کی ضیافت کا سامان کرنے لگی، اس وقت تک اسے یہ پتا نہیں تھا کہ امام صاحب اور علی اکبر و قاسم و عباس و عون و محمد وغیرہ جام شہادت نوش فرما چکے ہیں، اس پورے مرثیہ میں مرزا صاحب نے پہلے شیریں کے شوق و انبساط، حسن عقیدت، مہمانی و استقبال اور پھر درمیانی واقعات سے شدت تاثر اور جذبات کے تلاطم اور پھر امام اور ان کے اعوان کی وفات اور دوسرے دردانگیز مناظر پر شیریں کے طوفانِ غم کی جو تصویر کشی ہے اس نے مرثیے کو مبکی اور نہایت لاجواب بنا دیا ہے، وہ ان کی فن کاری وخلاقی کا بڑا اعلا نمونہ ہے، اہل فن اور نکتہ سنجوں نے اس کی بڑی داد دی ہے اور وہ واقعی داد وتحسین کا مستحق ہے، ہم شروع کے دو بند نقل کرتے ہیں:

جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے　　غل ہوا کعبے سے مولا مع لشکر آئے
کہا شیریں نے کہ ارمان دلی بر آئے　　میرے مولا، مرے سلطاں مرے سرور آئے
شان حق، نور خدا، قدرت باری دیکھو
جاؤ لوگو مرے آقا کی سواری دیکھو

جن سے روشن ہے مدینہ وہ قمر آتے ہیں　　جن کا معدن ہے نجف میں وہ گہر آتے ہیں
جن کا گھر عرش پہ ہے، وہ مرے گھر آتے ہیں　　(یہ خبر اس کو نہ تھی نیزوں پہ سر آتے ہیں)
کہہ رہی تھی کہ چراغ حرمین آتا ہے
اے مسلمانو! مبارک ہو حسین آتا ہے

مرثیہ اپنی تمام شاعرانہ اور تاثراتی خوبیوں کے باوجود ایک فرضی واقعہ اور عوام میں مشہور

قصہ پر مبنی ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں، بعض لوگوں نے مرثیہ گویوں کے لیے غیر معتبر واقعات اور غیر مستند روایات کے نقل کے جواز کی گنجائش پیدا کر دی ہے مگر محققین کے نزدیک یہ صحیح نہیں، ان کے نزدیک واقعہ کی اصلیت اور روایتوں کی روایتاً اور درایتاً صحت ضروری ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مرزا غالب کو ایران کی تاریخ اور زبانوں کے بارے میں کافی دھوکا ہوا ہے، سب سے بڑی غلطی دساتیر کا اقرار ہے، حالاں کہ وہ جعلی ہیں، اس پر پروفیسر نذیر احمد نے بڑی محققانہ بحث کی ہے۔(۱)

علم وتحقیق میں کوتاہی سے گم راہیاں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ مخطوطات ہوں یا مطبوعات ان کو ایڈٹ کرنے یا ان سے استفادہ کرنے والے کو مبصر، نقاد، وسیع النظر، متبحر عالم، محقق اور بہت محتاط ہونا چاہیے تاکہ وہ حقیقت و افسانہ، حق و باطل، صحیح و غلط اور اصلی و جعلی میں تمیز کر کے خود اپنے کو اور دوسرے کو بھی گم راہ ہونے سے بچائے، محقق کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ اپنی تحقیق میں صرف کسی مجہول الاصل یا غیر معتبر کتاب کا حوالہ دے دے بلکہ اس کی تلاش و جستجو بھی کرے کہ اس کتاب کا مصنف کہاں تک صادق اور ثقہ ہے، مختصرات قاضی عبدالودود میں ہر واقعے کے بعد وہ یہ بھی لکھ دیتے ہیں ''حکایات کی صحت کا میں ضامن نہیں'' مگر ان جیسے بڑے محقق کے لکھنے کی وجہ سے عام قاری کو یہ ضرور خیال ہوتا ہے کہ اس میں کسی حد تک صداقت یقیناً ہوگی، یہ بھی تحقیق میں گم راہی کا باعث ہوتا ہے۔

اب ہم مخطوطات کی کتابت اور اس کے بعض اندراجات کا ذکر کرتے ہیں جن سے کم نظر و کم سواد دھوکا کھا جاتے ہیں اور گم راہی میں پڑ جاتے ہیں۔

۱- عام خیال یہ ہے اور بڑی حد تک بجا بھی ہے کہ جتنا قدیم نسخہ ہوگا اتنا ہی معتبر ہوگا لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، کتابت کرنے والے کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کشف المحجوب کے ایک مخطوطہ کو ایک صاحب حضرت بہاء الدین زکریا کا کتابت شدہ بتاتے تھے، حالاں کہ وہ کاتب اس قدر کم علم تھا کہ اپنا نام بھی صحیح نہیں لکھ سکتا تھا یعنی زکریا (ذال) سے لکھا تھا، اس کے علاوہ اس نے اور بھی بہ کثرت غلطیاں کی تھیں۔

---

(۱) مقالات نذیر احمد، ص ۲۳۳ تا ۲۳۸، عزیز پرنٹنگ پریس دہلی، ۲۰۰۲ء۔

۲- انیس الارواح حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی نہایت مقبول کتاب ہے، انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات اس کتاب میں درج کیے ہیں، لیکن اس کا کوئی قریب العہد نسخہ موجود نہیں، بعد کے کسی نسخے سے اس کی کتابت کی گئی ہوگی اور عین ممکن ہے کہ کسی قاری نے اپنی پسند کی کوئی عبارت یا شعر اس کے متن یا حاشیے میں درج کر دیا ہوگا، کتابت کے وقت اسے بھی شامل کرلیا گیا، کتاب کے تمام اندراجات پر غور کیے بغیر صرف اس اضافے کی وجہ سے ہم فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ کتاب حضرت خواجہ کی نہیں ہے، اس طرح کے فیصلے اور کتابوں کے بارے میں بھی کیے گئے ہیں۔

۳- کتابوں کے مطالعہ میں بعض ناموں سے بھی دھوکا ہوتا ہے، مثلاً محی لاری کا دیوان حضرت عبدالقادر جیلانی کا سمجھ لیا گیا، معین فراہی کا دیوان حضرت خواجہ معین الدین سے منسوب کردیا گیا، بعد کے ایک قطب الدین کا دیوان حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے نام سے مشہور کیا گیا، ظہیر شاگرد صائب کا دیوان ظہیر فاریابی سے متعلق کر دیا گیا لیکن ایسے دواوین کی داخلی شہادتوں اور ان کی زبان و بیان سے اصل مصنف کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے۔

۴- بعض اوقات داخلی شہادت سے پڑھنے والا گومگو میں پڑ جاتا ہے، مثلاً میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا ۱۱۶۱ھ سے قریب ۱۱۶۵ھ تک لکھا گیا ہے، اس کے صفحہ ۵ پر مطبوعہ انجمن ترقی اردو حضرت مظہر جان جاناں کا نام جان جاں لکھا ہے جو بے شک صحیح ہے کیوں کہ ان کا ایک شعر بھی اسی طرح ہے کہ

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جان جاں اپنا

لیکن اوچ ریاست (دیر) والے مکتوبات کے مجموعے میں جو سات مکتوبات حضرت مظہر کے ہیں (اور دیر کا عکس بھی شامل ہے) ان کے شروع میں ہر جگہ یہی الفاظ ہیں "بعد حمد و صلوۃ از فقیر جان جاناں" (ان مکتوبات میں دو ایسے ہیں جو ۱۱۷۵ھ سے پہلے کے ہیں اور بقیہ پانچ ۱۱۹۰ھ کے قریب تک کے ہیں) ایسے شعروں اور ایسے مکتوبات سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حضرت مظہر نے اپنا نام جان جاں ضرورت شعری کی وجہ سے لکھا ہوگا اور نثر میں جان جاناں ہی لکھتے ہوں گے۔ (۱)

☆☆☆☆☆

(۱) ڈاکٹر نجم الاسلام، مجلہ تحقیق، ص ۱۱۱ و ۱۱۲، مضمون پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں۔

اندلس میں معاشرتی تنوع اور رواداری

از:- جناب محمد احمد زبیری صاحب☆

مسلمانوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں اندلس پر حملہ کیا، طارق بن زیاد نسلاً بربر تھا، مسلمانوں کا لشکر مختلف عرب قبائل پر مشتمل تھا، ان میں عدنانی بھی تھے اور یمنی بھی، مصری، شامی، عراقی اور بربروں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی فاتحین کے لشکر میں شامل تھی، جب یہ مختلف نسلی پس منظر رکھنے والے لوگ اندلس میں مقیم ہوئے تو انہوں نے قوطی اور دیگر ہسپانوی خواتین سے شادیاں بھی کیں لیکن بدقسمتی سے جو نسلی تعصب مشرق میں تھا وہ اندلس میں بھی برقرار رہا، جس نے فتح اندلس سے لے کر مسلمانوں کے اندلس سے اخراج تک کسی نہ کسی صورت میں افتراق و انتشار کو ہوا دی اور عیسائیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، جب کسی کو بنوقیس سے امیر بنایا جاتا تو وہ یمنیوں کو نشانہ بناتا اور مضریوں کو اپنے قریب لاتا اور اسی طرح جب کوئی یمنی امیر بن جاتا تو وہ بنوقیس کو اپنی عداوت کا نشانہ بناتا، حتیٰ کہ تنگ آکر انہوں نے معاہدہ کیا کہ ایک سال امارت بنوقیس میں رہے گی اور ایک سال یمنیوں میں سے امیر ہوگا، اس لیے ابتدائی تھوڑے سے عرصے میں تقریباً چالیس کے قریب امیر تخت نشین ہوئے۔

ابن اثیر (۶۳۰ھ) نے "الکامل" میں لکھا ہے کہ نزاری اور یمنی عربوں میں جو جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے تھے بعض دفعہ ان کی کشمکش اس نوبت کو پہنچ جاتی تھی کہ:

اقتتلوا بالرماح حتی تقطعت
وبالسیوف حتی تکسرت
ثم تجاذبوا بالشعور۔ (۱)

نزاری عرب اور یمنی عرب پہلے تو نیزوں سے لڑتے یہاں تک کہ نیزے ٹوٹ جاتے، پھر تلواروں سے لڑنا شروع کرتے، جب تلواریں ٹوٹ جاتیں تو ایک دوسرے کو

☆ لیکچرر دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

بالوں سے پکڑ کر کھینچتے تھے۔

اندلس کے نسلی گروہ

اہل اندلس کو چار بڑے نسلی گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

عرب: جو کہ اپنے آپ کو حکم راں اور بالاتر تصور کرتے ہیں اور اپنی زبان کی دیگر زبانوں پر فضیلت کو اپنے لیے قابل افتخار سمجھتے تھے۔

بربر: بربر اپنی بدویت اور شجاعت کی وجہ سے اپنے آپ کو عربوں کے ہم سر سمجھتے تھے۔

ہسپانوی: زیادہ تر کیتھولک عیسائی تھے اور اس ملک کے اصل باشندے تھے جو عربوں اور بربروں کو اپنے ملک پر قابض اور غاصب تصور کرتے تھے۔

مولدون: وہ نسل جو عربوں اور بربروں کی باہمی شادیوں یا عربوں اور ہسپانوی خواتین کی باہمی شادیوں سے پیدا ہوئی، اندلس کی تاریخ میں مولدون نے بڑا اہم کردار ادا کیا، مقامی باشندوں نے اسلام قبول کیا اور عربی زبان سیکھی، عربی زبان کے فروغ اور شعر و ادب میں اہل اندلس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اندلس کی اموی حکومت

اندلس کی امارت، دمشق میں اموی خلافت کے تابع ہوتی تھی، اموی خلفا اندلس کے لیے گورنر مقرر کرتے تھے یا بعض اوقات افریقہ کے کسی والی کے دائرہ اقتدار میں اندلس کے لیے گورنر مقرر کرتے تھے، بعض اوقات افریقہ کے کسی والی کے دائرہ اقتدار میں اندلس کو بھی شامل کردیا جاتا، اموی خلافت کے خاتمے کے بعد جب اقتدار عباسیوں کے ہاتھ میں آیا، ہشام بن عبدالملک (۱۲۵ھ) کا پوتا عبدالرحمن اندلس پہنچا اور زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی، عبدالرحمن الداخل نے اپنی فہم و فراست اور بہادری سے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی، جس طرح ابوجعفر منصور نے عباسی خلافت کو استحکام بخشا بالکل اسی طرح عبدالرحمن نے مضبوط بنیادوں پر اپنی حکومت و سلطنت کو استوار کیا، عبدالرحمن کے بعد اس کی اولاد نے شجاعت اور بہادری کے ساتھ حکومت کی لیکن شمال کی سمت میں عیسائیوں کے باغی گروہ کو مسلمانوں نے ختم نہیں کیا، جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ پریشان رکھا اور وقتاً فوقتاً وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے رہتے، کبھی فتح یاب ہوتے اور کبھی انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑتا، بالآخر یہ گروہ اتنا مضبوط اور طاقت ور ہوگیا کہ مسلمان اپنی باہمی لڑائیوں میں ان سے مدد لینے لگے اور ایک دن وہ آیا جب انہوں نے پورے

اندلس پر قابض ہوکر مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا۔

عبدالرحمن ناصر (۹۶۱ء) کا دور اندلس کی تاریخ کا زریں دور کہا جاتا ہے جسے قدرت نے پچاس سال تک حکومت کرنے کا موقع دیا، اس کے دور حکومت میں فاطمیوں نے اپنے عقائد اور تعلیمات کا پرچار کرنا شروع کیا لیکن عبدالرحمن ناصر (۹۶۱ء) نے انہیں ان کی سازشوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا، عبدالرحمن ناصر نے ایک نئی فوج تشکیل کی جو مملوکوں پر مشتمل تھی، جنہیں صقالبہ بھی کہا جاتا ہے، یہ زیادہ تر ان قیدیوں اور غلاموں پر مشتمل تھی جو مختلف جنگوں کے دوران مسلمانوں کے ہاتھ لگے، اندلس میں غلاموں کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی، جس کا دھندا یہود کے ہاتھ میں تھا۔

عبدالرحمن ناصر (۹۶۱ء) کے زمانے میں صقالبہ نے حکومت کے نظم و نسق میں کافی اثر و رسوخ حاصل کرلیا تھا، جس طرح معتصم اور بعد کے آنے والے خلفا کے زمانے میں ترکوں نے اہمیت حاصل کرلی تھی بالکل یہی حیثیت اندلس کی انتظامی مشینری میں صقالبہ کی تھی، عبدالرحمن ناصر عرب اور بربروں کی نسبت ان پر زیادہ اعتماد کرتا تھا، فوج کے ایک بڑے یونٹ کی کمان بھی عبدالرحمن نے ایک صقلبی کے ہاتھ دے رکھی تھی، عبدالرحمن کے زمانے میں امن و امان کی صورت حال کافی بہتر تھی اور اسے ایک طویل عرصہ حکومت کرنے کا موقع ملا جس کے نتیجے میں اندلس کے اندر تہذیب و تمدن نے تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی، قرطبہ یورپ کے اندر سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن شہر بن گیا اور اسے ''عروس البلاد'' کا لقب ملا، تجارت اور زراعت کے شعبوں میں بے انتہا ترقی ہوئی، حکومت کی سرکاری آمدنی بیس ملین دینار تک پہنچ گئی۔ (۲)

اموی خاندان کی حکومت پر گرفت کم زور پڑتے ہی ابن ابی عامر کے ہاتھ اقتدار آیا اور اندلس کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اس کے بعد اندلس کے اندر امن و امان اور حکومت کے استحکام والی سابقہ کیفیت باقی نہ رہی، ملوک الطوائف نے اندلس کے ہر بڑے شہر کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور ایک ملک کے اندر چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح کئی حکومتیں اور تخت وجود میں آگئے، باہمی لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدال نے مسلمانوں کی قوت کو پراگندہ کردیا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمان اپنی لڑائیوں میں عیسائیوں سے مدد لینے لگے، یوں مسلمانوں

کے باہمی افتراق اور انتشار نے ان کے آٹھ سوسالوں پر محیط اقتدار کی بساط لپیٹ دی، مرابطین اور موحدین نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرنے اور اندلس کو دوبارہ اسلامی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی یہ کوششیں رنگ نہ لائیں۔

اندلس میں عربی زبان کی ترویج اور عیسائیوں کا ردعمل

مسلمانوں نے اہل اندلس کو محض شمشیر کے زور پر فتح نہیں کیا بلکہ ان کے دل و دماغ کو اپنے دین، تہذیب اور زبان کے ذریعے مفتوح کیا، اہل اندلس نے عربی زبان کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت سے متاثر ہوکر عربی سیکھی، حتی کہ اپنی لاطینی زبان بھول گئے، جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے اور عیسائی رہے، انہوں نے بھی عربی کو سیکھا اور عربی زبان و ادب کی ترویج میں اپنا حصہ ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس زبان میں عیسائیوں کا علم دین مدون تھا، اس کو عیسائی رفتہ رفتہ بھولنے لگے اور اس کی طرف سے غفلت برتنے لگے، حتی کہ کلیسا کے بعض بلند مرتبہ عہدے دار بھی صحیح لاطینی سے ایسے نابلد ہوگئے کہ ان پر اہل علم کو ہنسی آتی تھی، ان حالات میں عوام الناس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس معاملے میں وہ ارباب کلیسا سے زیادہ سرگرمی دکھائیں گے، چنانچہ ۸۵۴ء میں اندلس کے ایک مصنف، قرطبہ کے اسقف الوارو نے اپنے عیسائی ہم وطنوں کے اس رویے کی شکایت ان الفاظ میں کی ہے:

" While we are investigating their (i.e. the Muslim) sacred or dinances and meeting together to study the sects of their Philosopheres-- or rather philobraggers-- not for the purpose of refuting their errors, but for the exquisite charm and for the eloquence and beauty of their language-- neglecting the reading of the Scriptures, we are but setting up an idol the number of the beast. Where nowadays can we find any learned layman who, absorbed in the study of the Holy Scriptures, cares to look at the works of any of the Latin Fathers? Who is there with any zeal for the writings

of the Evangelists, or the Prophets, or Apostles? Our Christian young men, with their elegant airs and fluent speech, are showy in their dress and carriage, and are famed for the learning of the gentiles; intoxicated with Arab eloquence they greedily handle, eagerly devour and zealously, discuss the books of the Chaldeans (۲)

”جب ہم مسلمانوں کے شرعی احکام کی تحقیق کرتے ہیں اور ان کے حکما (بلکہ حمقاء) کے طبقات کے مطالعے کے لیے جمع ہوتے ہیں (ان کی ضلالتوں کی تردید کی غرض سے نہیں بلکہ ان کی زبان کی لطافت اور اس کی فصاحت و بلاغت سے محظوظ ہونے کے لیے) تو ہم اپنی مقدس کتابوں سے غافل ہوگئے ہیں اور پرستش کے لیے ایک حیوان کو اپنا بت بنا رہے ہیں، اب عیسائیوں میں ایسے ذی علم کہاں ہیں جو مقدس کتابیں پڑھنے میں انہماک رکھتے ہوں اور لاطینی علمائے دین کی کتابوں پر نگاہ ڈالنے کی پروا کرتے ہوں؟ کون ہے جو انجیلوں یا انبیا اور رسولوں کی کتابوں کو پڑھنے کا شوق رکھتا ہو، ہمارے عیسائی نوجوان جو اطوار کی شستگی اور چرب زبانی سے متصف ہیں، اپنے لباس اور چال ڈھال کی نمائش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے علوم میں شہرت رکھتے ہیں، وہ عربی بلاغت کے نشے میں سرشار ہیں اور مسلمانوں کی کتابوں کو اٹھاتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، ان پر بحث کرتے ہیں“۔

اندلس کے باشندوں کے حالات و خصوصیات

اہل اندلس صفائی اور طہارت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، ایک شخص کھانے پینے کے معاملے میں اوسط درجے کی غذا پر گزارا کرلیتا تھا لیکن وہ اپنے لباس اور جسم کی صفائی کو اولین حیثیت دیتا تھا، اگر کسی شخص کے پاس صرف اتنے پیسے ہوتے کہ وہ صابن یا کھانا دونوں میں سے ایک خرید سکتا تو وہ بھوکا رہنا برداشت کرلیتا لیکن اسے میلا کچیلا رہنا گوارا نہیں تھا۔

اکثر لوگ ننگے سر رہتے تھے، بعض اوقات بازاروں میں قاضی یا مفتی بھی پگڑی کے بغیر ننگے سر چلتے پھرتے نظر آجاتے تھے، پگڑی یا عمامہ باندھنے کا رواج بہت کم تھا۔

مشرق میں غم اور سوگ کے اظہار کے لیے سیاہ لباس پہنا جاتا ہے، اہل اندلس کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ اظہار غم کے لیے سفید لباس پہنتے تھے، ایک شاعر ان کی اس روش کا یوں اظہار کرتا ہے:

يقولون البياض لباس حزن ... بأندلس، فقلت من الصواب

ألم ترني لبست بياض شعري ... لأني قد حزنت على الشباب

(ترجمہ) لوگ کہتے ہیں کہ اندلس میں سفید لباس غم کی علامت ہے، میں کہتا ہوں یہ بات بالکل درست ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میرے بالوں میں سفیدی نمایاں ہوگئی ہے، یہ اس لیے ہے کہ میں اپنی جوانی کا سوگ منا رہا ہوں۔

اہل اندلس اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اس کا اظہار تذکرہ نویسی اور سوانحی لٹریچر سے ہوتا ہے، جس میں ہر عالم کے حالات زندگی کے ساتھ مالقی، غرناطی، شاطبی، بلنسی اور جیانی وغیرہ کے القاب کثرت سے نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تدریس کا طریقہ بھی اندلس میں اہل مشرق سے مختلف تھا، مشرق میں پہلے بچے کو قرآن مجید ناظرہ یا حفظ کرادیا جاتا ہے جب کہ اہل اندلس پہلے بچوں کو عربی زبان سکھلاتے، جب بچے کے اندر اتنی استعداد پیدا ہوجاتی کہ قرآن مجید کے ترجمے اور مفہوم کو سمجھنے کے قابل ہوجاتا تب اسے قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی۔(۴)

اہل اندلس بلند ہمت اور عالی حوصلہ تھے، نام وری اور کمال حاصل کرنا ان کا مشغلہ تھا، اس لیے اندلس میں کثرت سے شورشیں اٹھتی رہتی تھیں، کیوں کہ تخت و تاج تک پہنچنے کی خواہش انہیں بے کل کیے رکھتی تھی، علم حاصل کرنے کا انہیں جنون کی حد تک شوق تھا، اس لیے اندلس کی تاریخ میں علوم و فنون کے اتنے ماہرین اور علما گزرے ہیں اور اتنے بڑے بڑے نام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں جو کسی اور خطۂ زمین میں نظر نہیں آتے، اہل اندلس نے اپنے علما اور فضلا کے

حالات زندگی اور سوانح کو محفوظ کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے لیکن اس کے باوجود ابن حزم (۴۶۷ھ) علما کے بارے میں اہل اندلس کے رویے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فان هممهم قد قصرت عن تخليد مآثر بلدهم ومكارم ملوكهم ومحاسن فقهائهم ومناقب قضاتهم ومفاخر كتابهم وفضائل علمائهم۔(۵)

اہل اندلس اپنے ملک کی خصوصیات کو محفوظ کرنے میں کوتاہ ہمت ہیں، ان کے بادشاہوں کی فضیلت، علما کے محاسن، قاضیوں کے فضائل، انشا پردازوں کے کارنامے اور علما کے فضائل محفوظ کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ابن حزم (۴۶۷ھ) کا شکوہ اپنی جگہ بجا لیکن اس کے باوجود اہل اندلس کے ہاں طبقات نگاری اور سوانح نگاری کے فن نے عروج حاصل کیا اور ہر طبقے اور ہر فن کے ہزاروں افراد کے حالات زندگی محفوظ کیے گئے، نامعلوم کتنی کتابیں دشمنوں کی آتش عداوت کی نذر ہوگئیں لیکن اس کے باوجود جو زمانے کی دست برد سے بچ رہیں، ان کی تعداد اور ان میں درج علما کے حالات زندگی اور ان کی تالیفات کی فہارس پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے، ابن حزم اہل اندلس کی اس روش کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فالحكم في ذلك ما جرى به المثل السائر "أزهد الناس في عالم أهله" وقرأت في انجيل أن عيسى عليه السلام قال "لا يفقد النبي حرمته إلا في بلده" وقد تيقنا ذلك بما لقي النبي ﷺ من قريش وهم أوفر الناس أحلاما وأصحهم عقولا وأشدهم تثبتا مع ما خصوا به من سكناهم افضل البقاع وتغذيتهم باكرم المياه حتى خص

اس ساری صورت حال پر یہ ضرب المثل صادق آتی ہے کہ "دنیا میں سب سے زیادہ کسی عالم کے اہل علاقہ اس سے بے پروائی برتتے ہیں، میں نے انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول پڑھا ہے کہ "نبی کی عزت و حرمت میں کمی صرف اس کے اپنے شہر میں ہوتی ہے"، اس کی تصدیق حضور اکرم ﷺ کے ساتھ قریش کے برتاؤ سے بھی ہوتی ہے، حالانکہ قریش دیگر تمام اقوام سے زیادہ بردبار، ان سے زیادہ عقل مند اور معاملہ فہمی

اللہ تعالی الاوس والخزرج
بالفضیلۃ التی أبانهم بها عن
جمیع الناس واللہ یوتی فضله من
یشاء، ولاسیما أندلسنا فانها
خصت من حسد أهلها للعالم
الظاهر فیهم الماهر منهم
واستقلالهم کثیر ما یاتی
به واستهجانهم حسناته
تتبعهم سقطاته وعثراته
وأکثر ذلک مدة حیاته
باضعاف مافی سائر البلاد
إن اجاد قالوا سارق مغیر
ومنتحل مدع وإن توسط
قالوا غث بارد وضعیف
ساقط وإن باکر الحیازة
لقصب السبق قالوا متی
کان هذا؟ ومتی تعلم؟
وفی ای زمان قرأ؟ (۶)

میں زیادہ تجربہ کار تھے کیوں کہ وہ زمین کے افضل ترین ٹکڑے کے باشندے اور بہترین اور پاکیزہ پانی کے پروردہ تھے لیکن حضور اکرم ﷺ کی میزبانی اور نصرت کا شرف اوس اور خزرج کو حاصل ہوا، یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے، ہمارے اندلس میں تو بالخصوص اہل اندلس ایک ماہر اور نامور عالم کے ساتھ حسد کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اس کے علم و فضل سے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہیں، اس کی خوبیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس کی لغزشوں اور فروگزاشتوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور زندگی بھر اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہتے ہیں، یہ طرز عمل دنیا کے کسی بھی دوسرے خطے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے، اگر وہ عالم بہت زیادہ مہارت اور حسن و خوبی کا مظاہرہ کرے تو کہتے ہیں یہ تو سرقے کا مرتکب اور دوسرے کے علم و فضل کو اپنی طرف منسوب کر رہا ہے، اگر علمی اعتبار سے اس کی کارکردگی متوسط ہو تو کہتے ہیں بے چارہ معمولی حیثیت کا مالک ہے اور علم و معرفت سے تہی دامن ہے، اگر وہ تمام شہ سواروں پر سبقت لے جائے تو تعجب کرتے ہیں، یہ کہاں اس قابل تھا، اس نے علم کہاں سے حاصل کیا، کب اور کس زمانے میں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔

یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کا روادارانہ برتاؤ اور ان کی علمی خدمات

اندلس میں یہودیوں کی ایک خاصی بڑی آبادی تھی لیکن عیسائی پادری اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر ان پر ظلم و ستم کرتے تھے، جو لوگ اصطباغ لینے سے انکار کرتے تھے، ان کے خلاف وحشیانہ قسم کے سخت مظالم کے احکام جاری کرتے تھے، ان سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمانوں نے اندلس پر چڑھائی کی تو یہودیوں نے حملہ آوروں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا، جن شہروں کو مسلمان فتح کر چکے تھے ان کی حفاظت کے لیے سپاہ کا کام دیا اور جن شہروں کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا، ان کے دروازے کھول دیے۔ (۷)

مسلمانوں کے دور حکومت میں یہودیوں نے سکھ کا سانس لیا، ان کی معاشرتی حیثیت بحال ہوئی، انہیں مذہبی آزادی ملی، کاروبار حیات کے ہر شعبے کے اندر مسلمانوں نے یہودیوں کو خوش آمدید کہا، مسلمانوں کے مدارس اور جامعات میں عیسائی اور یہودیوں کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور مسلمانوں نے کبھی انہیں حقارت یا نفرت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ ان کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی رویے کا مظاہرہ کیا، مسلمانوں کے اس ہمدردانہ رویے اور سلوک کو دیکھ کر شمالی افریقہ، عراق اور دیگر ہم سایہ ممالک سے یہودی ہجرت کر کے اندلس میں آباد ہونا شروع ہوئے، جس کے نتیجے میں یہودیوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، یہودی زیادہ تر قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ میں آباد ہوئے، ریمونڈ پی شینڈلن (Raymond P. Scheindlin) اس صورت حال کے بارے میں لکھتا ہے:

The Jewish community of Muslim Spain from the time of Abdal-Rahman IIIreigned (300/912-350/961) until the Almohads (after 535/1140) had distinctive character among medieval Jewish communities. No other Jewish community produced as many Jews who achieved positions of states and even power in the non-Jewish world; and no other Jewish community produced such an extensive literary

culture reflecting the deep impact of an intellectual life shared with non Jews (۸)

"مسلم اسپین کی یہودی آبادی عبدالرحمن ثالث کے دور حکومت سے لے کر موحدون کے برسر اقتدار آنے تک قرون وسطی کی یہودی معاشروں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، کوئی اور یہودی کمیونٹی کسی غیر یہودی اکثریتی معاشرے میں اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس میں یہودیوں نے اس قدر معاشرتی حیثیت اور کلیدی مناصب حاصل کیے ہوں، غیر یہودیوں کے ساتھ مل کر یہودیوں نے جس شان دار ادبی اور ثقافتی نقوش کو دانش ورانہ زندگی پر ثبت کیا اس کی کوئی اور مثال اندلس کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی"۔

اس صورت حال کے بارے میں The Rise and Fall of the Party kings کے مولف David Wassersten لکھتا ہے:

"The legendary story of a Jewish scholar who came to Al-Andalus and established Jewish scholarly independence in the Peninsula in the tenth century, contained in a twelth century Hispano-Jewish historical work, reflects the growing independence of the Jewish cultural world in the Peninsula from external, oriental influences at that time" (P.K. p. 195 (۹)

اندلس میں وارد ہونے والے یہودی دانش ور کی افسانوی کہانی جو دسویں صدی عیسوی میں اندلس آیا اور جس نے بارھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی یہودی تاریخی علمی ورثے کو فروغ دیا، یہ علمی ورثہ اس زمانے میں جزیرہ نما میں یہودی آبادی کی خود مختار ثقافتی دنیا کی عکاسی کرتا ہے جو کسی خارجی یا مشرقی اثرات سے یکسر پاک تھا۔

یہودیوں کو مذہبی رواداری اور اظہار مافی الضمیر کی کس حد تک آزادی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابن نغریلا جو سیاسی اعتبار سے وزارت کے منصب پر فائز تھا،

اندلس کے عظیم عالم ابن حزم سے مناظرہ کرتا ہے اور اسے اپنے خیالات اور اسلام اور قرآن کے بارے میں اپنے اعتراضات پوری آزادی کے ساتھ پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے David Wassersten لکھتا ہے:

"In his youth Ibn Naghrila had an encounter with Ibn Hazm, probably the greatest Muslim scholar of the century in the Iberian Peninsula (۱۰)

جوانی میں ایک دفعہ ابن نغریلا کو ابن حزم کے ساتھ ایک مناظرہ کرنے کا موقع ملا جو غالباً جزیرہ نما میں اس صدی کے اندر سب سے بڑے مسلمان عالم تھے۔

سرقسطہ میں ایک اور یہودی وزیر کا تذکرہ ملتا ہے جو بنیادی طور پر طبیبوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس کا دادا الحکم ثانی کے دربار سے وابستہ تھا اور ان کا ذاتی معالج تھا، اس کے بارے میں David Wassersten لکھتا ہے:

"In Saragossa a rather better known Jewish vizier was Abu al Fadl Hasday b. Yusuf Ibn Hasday, a member of a family of distinguished scholars and doctors. He was also a doctor, and served the Hudid rulers of the Saragassan state in the second half of the fifth / eleventh century as a vizier and katib" (۱۱)

سرقسطہ میں ایک معروف یہودی وزیر ابوالفضل حسدے بن یوسف بن حسدے جو کہ ممتاز دانش ور اور طبیبوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا (کا تذکرہ ملتا ہے)، ابوالفضل بھی ایک ڈاکٹر تھا، اس نے پانچویں صدی ہجری رگیارھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں سرقسطہ کے دربار میں بنوہود کے وزیر اور سکریٹری کے طور پر کام کیا۔

مسلم اسپین کی یہودی آبادی عبدالرحمن ثالث کے دور حکومت سے لے کر موحدون کے برسر اقتدار آنے تک قرون وسطی کے یہودی معاشروں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، کوئی اور

یہودی کمیونٹی کسی غیر یہودی اکثریتی معاشرے میں اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، جس
میں یہودیوں نے اس قدر معاشرتی حیثیت اور کلیدی مناصب حاصل کیے ہوں، غیر یہودیوں کے
ساتھ مل کر یہودیوں نے جس شان دار ادبی اور ثقافتی نقوش کو دانش ورانہ زندگی پر ثبت کیا، اس کی
کوئی اور مثال اندلس کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔

عبدالرحمن ثالث کے زمانے میں یہودیوں نے ثقافتی اور علمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا، بہت سارے یہودی لاطینی، یونانی اور عبرانی کے علاوہ ہسپانوی اور عربی بھی جانتے تھے،
حکومت اور ایوان اقتدار میں ان کا اچھا اثر ورسوخ تھا، یہ یہودی عام رعایا سے الگ تھلگ اپنی
دنیا آپ تھے، حسدے ابن شبروت درباری طبیب ہونے کے علاوہ خزانچی اور عبدالرحمن ثالث کا
وزیر بھی تھا، اس نے علم نباتات سے متعلق بعض کتابوں کا لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

حسدے مشہور طبیب الزہراوی کا رفیق کار تھا، حسدے کے اس اثر ورسوخ کو دیکھتے
ہوئے بہت سارے یہودی عراق سے آئے اور انہوں نے قرطبہ کے اندر تالمود کی تعلیمات کو
پھیلانے کے لیے ایک مدرسہ بھی کھولا، یہ اسکول اپنی علمی وقعت اور شان وشوکت میں میسوپوٹیمیا
کے دیگر مدارس سے کسی طور پر کم نہ تھا، اس اسکول کی وجہ سے عبرانی شاعری نے ترقی کی، حسدے
کی وجہ سے عبرانی شاعری اور عبرانی زبان کو نئی زندگی ملی۔

یہودی تاجروں کی وجہ سے جو غلاموں اور دیگر قیمتی اشیا کی خرید وفروخت کرتے تھے،
اندلس کو معاشی اعتبار سے استحکام ملا، انہوں نے عیسائی اور مسلم ممالک کے اندر اپنی تجارت کو
فروغ دیا، سقوط قرطبہ کے بعد یہ یہودی بھی منتشر ہوگئے، اس کے بعد بنوزیری کے حکم رانوں
حابوس اور بادیس کے دور اقتدار میں انہیں دوبارہ غرناطہ کے اندر یک جا ہونے کا موقع ملا۔

سموئیل ابن نغریلا جو کہ شاہ غرناطہ حابوس کا وزیر تھا، اس نے تالمود اور یہودی تعلیمات
کے فروغ کے لیے بڑا کام کیا اس نے کلیسا کی پیروی میں دعائیہ نظموں پر مشتمل ایک کتابچہ بھی تحریر کیا۔

ایک مشہور یہودی نجومی عیسیٰ ابن البالس جو کہ بادیس کے دور اقتدار میں غرناطہ چھوڑ کر
امیر اشبیلیہ کے دربار سے وابستہ ہوگیا، مالقہ کے ایک مشہور یہودی شاعر سلمان (۱۰۲۱-۱۰۷۰)
نے بہت ساری کتابیں عربی میں لکھیں جن کا بعد میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ (۱۲)

اس کے علاوہ کئی اور یہودی مولفین اور شاعروں کے نام بھی ملتے ہیں، سلمان ابن
زاچبل (Solmon Abenzachbel) نے مقامات حریری کی طرز پر ایک ناول بھی لکھا۔

یہودیوں کے ذریعے مسلمانوں کے علوم وفنون یورپ کی دیگر اقوام تک پہنچے، اندلس
اور سسلی دو ایسے ممالک تھے جہاں کے علمی مراکز سے عربی طبی علوم پورے یورپ میں پھیلے لیکن
اس سلسلہ میں اندلس کو سسلی سے کہیں زیادہ فوقیت حاصل تھی، اندلس کے یہودیوں نے جن کا
ذریعہ تعلیم عربی تھا، طب اور فلسفہ کی کتابوں کے عبرانی ترجمہ میں خصوصاً سرگرمی سے حصہ لیا، عمومی
سائنس کی تاریخ میں یہ تراجم بہت اہمیت کے حامل ہیں، ان تراجم کے ذریعے سے یورپ کے
اندر علوم وفنون کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، طلیطلہ سے روانہ ہونے والا علمی اور فکری قافلہ
پائیرنیز (Pyrenees) سے راہ بناتے ہوئے الپائن (Alpine) کے دروں سے ہوتے ہوئے
لورین (Lorraine)، جرمنی، وسط یورپ اور خلیج برطانیہ کو عبور کرتے ہوئے برطانیہ تک پہنچ گیا۔

عربی سے عبرانی زبان میں ترجمہ کرنے والوں میں ابراہیم بن عذرا کا نام آتا ہے، یہ اندلس
کا یہودی تھا، مسلمان مصنفین کی کتابوں کو عبرانی میں منتقل کرنے والوں میں اس کا نام سرفہرست
نظر آتا ہے، اسپونزا اس کی بہت تعریف کرتا ہے، اندلس میں مسلمانوں اور یہودیوں نے مل کر
جن عقلی رجحانات کو فروغ دیا تھا، ابراہیم بن عذرا نے مسیحی یورپ کے یہودیوں میں ان کی
اشاعت کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

داؤد بن یعیش ایک اندلسی یہودی تھا، جس نے داخلی معاشیات پر ایک یونانی رسالہ کے
عربی نسخہ کو عبرانی میں منتقل کیا، عہد وسطیٰ کے افکار ورجحانات پر بھی اس کے اثرات پڑے کیوں کہ
یہ رسالہ اگرچہ اصل یونانی زبان میں مفقود ہوچکا تھا، البتہ عربی، لاطینی اور عبرانی میں موجود تھا۔

یحیٰ بن یوسف کی کتاب ''الھدایۃ الی فرائض القلوب'' کا عبرانی میں ترجمہ
کیا، اس کے علاوہ اس نے ابراہیم بن عذرا اور ابراہیم بارحیا کی علمی اور ترجمہ کی سرگرمیوں کو
جاری رکھا تاکہ مسیحی یورپ عرب یہودی افکار سے پوری طرح آگاہ ہوجائے، یوسف بن یشوع
ہلورجی نے ''رسالۃ موسیٰ بن میمون فی المنطق'' کا دوسرا عبرانی ترجمہ کیا۔

یوسف بن یتوع ۱۱ ہلورجی نے ابن سینا کی ''القانون'' کے ایک حصہ اور ابن سینا

کی بعض دیگر کتب کا عبرانی میں ترجمہ کیا، سموئیل بن تبون (۱۲۰۰ء) نے ارسطو کے رسالہ "رسالة ارسطو فی الاجرام السماویة" کے عربی ترجمہ یحییٰ بن بطریق کا عبرانی میں ترجمہ کیا، سموئیل ابن تبون ایک عالم دینیات اور فلسفی تھا، اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اسکندریہ اور موصل میں گزارا اور خصوصیت کے ساتھ موسیٰ بن میمون کے فلسفہ کی مغرب میں اشاعت کی۔

سموئیل بن ماتل قشتالہ کا رہنے والا تھا، جس نے عبداللہ بن محمد البطلیوسی کی کتاب "الحدائق"، ابراہیم بن داود کی کتاب "العقیدة الرفیعة" کا ترجمہ کیا۔

مارک آر کوہن (Mark R. Cohen) مسلمانوں کی رواداری اور یہودیوں کی تاریخ میں اس عہد کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"Jewish intellectuals seeking a historical precedent for a more tolerant atttude towords Jews hitupon a time and place that met this criterion medieval Muslim Spain. There, they believed, Jews had achieved a remarkable level of toleration, political achievement and cultural integration"(۱۳)

یہودی دانش ور جب رواداری پر مبنی رویے کی تاریخی مثال ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ زمان و مکان کے لحاظ سے عہد وسطیٰ کے مسلم اسپین کی نظیر پیش کرتے ہیں، ان کے خیال میں اندلس میں انہوں نے قابل ذکر رواداری، سیاسی حیثیت اور ثقافتی تعامل کے شان دار مواقع حاصل کیے۔

اندلسی معاشرہ اور خواتین

اندلسی معاشرے میں تہذیب و تمدن اور ثقافتی سرگرمیوں میں خواتین کا کردار نہایت اہم اور قابل ذکر ہے، معاشرے کے تمام شعبوں میں خواتین حقیقی معنوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ شریک تھیں، ان کی ثقافتی اور معاشرتی سرگرمیوں کو نہ صرف ضروری خیال کیا جاتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، اندلسی خواتین نے تعلیم اور سیاست کے میدان میں دل چسپی لی، بہت ساری خواتین روزگار اور معاش کے سلسلے میں خود کفیل تھیں اور وہ مردوں

کی دست نگر نہیں تھیں، وہ اپنے خاوندوں کے ساتھ جائداد کی مالک تھیں اور اس جائداد میں اپنی مرضی سے تصرف کرسکتی تھیں۔

خواتین کو مردوں کی طرح اعلا تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل تھے، اس لیے اندلس میں نام ور شعرا، ادیب اور زبان و ادب کی ماہر خواتین کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے، اندلسی معاشرے میں خواتین اپنی طبقاتی، معاشرتی، مذہبی اور نسلی لحاظ سے کئی طبقات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں عرب خواتین، عیسائی خواتین، بربر خواتین، دیہاتی خواتین، شہری خواتین، اونچے طبقے اور شرفا سے تعلق رکھنے والی خواتین اور متوسط اور غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین اور باندیاں شامل ہیں، خواتین کے بارے میں تاریخی مصادر میں جو معلومات ملتی تھیں وہ زیادہ تر شاہی خاندان اور امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین ہیں۔

اندلسی خاندان اور گھریلو زندگی کے بارے میں یک جا معلومات کی بہت کمی ہے تاہم مختلف مصادر کے اندر منتشر معلومات کو اگر اکٹھا کیا جائے تو ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آسکتی ہے، مثلاً لسان الدین ابن الخطیب کی "الاحاطه فی اخبار غرناطه" کے اندر امیر ابن ہود کی بیوی کا تذکرہ ملتا ہے جو تعدد ازواج کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے اور اس کا خاوند وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کی موجودگی میں زندگی بھر دوسری شادی نہیں کرے گا"۔(۱۴)

خواتین کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں جاننے کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی نظام کا ڈھانچہ اور اس کے ارکان کے باہمی تعلق کے بارے میں وافر معلومات دست یاب ہوں، اس سلسلے میں سرکاری دستاویزات خصوصاً فتاویٰ بہت مفید اور معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔(۱۵)

دستیاب تذکرہ نویسی اور سوانحی لٹریچر میں تقریباً ۱۱۶ اعلا تعلیم یافتہ خواتین کا ذکر ملتا ہے، ان خواتین کا زمانہ دوسری صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری کے درمیان ہے، ان میں دو خواتین عالمہ فاطمہ مغامی اور حفصہ بنت حمدون کا ذکر ہے، ان میں چوالیس شاعرہ اور بارہ ادیبہ ہیں۔

گیارہ خواتین سکریٹری کے طور پر کام کرتی تھیں، چار کتابت کی ماہر تھیں، تین عربی لغت کی ماہر اور دو عربی گرائمر کی ماہر تھیں، چھ خواتین نے حدیث کے اندر کمال حاصل کیا، چار خواتین نے تاریخ نویسی کو اپنایا، ایک خاتون کا ذکر بہ طور ماہر علم کلام اور ایک کا میراث کی عالمہ

کے طور پر ذکر ملتا ہے۔

عائشہ بنت احمد (۴۰۰ھ) جو کہ قرطبہ کے ایک شہزادے کی بیٹی تھی، اس نے اپنے آپ کو تعلیمی سرگرمیوں کے لیے وقف کر رکھا تھا، اس کی بہت بڑی ذاتی لائبریری تھی، تحصیل علم کے لیے اس نے عمر بھر شادی نہیں کی۔(۱۶)

حفصہ بنت حمدون گیارہویں صدی عیسوی کی مشہور شاعرہ ہے، اس کے علاوہ وہ بہت ماہر خطاط تھی، بہت سارے مرد خطاطی سیکھنے کے لیے اس کے پاس آتے تھے، ابن الفرضی اور ابن الابار دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔(۱۷)

مریم بنت یعقوب نے شاعری اور ادب کے اندر مہارت حاصل کی، العروضیہ (۴۵۰ھ) جو کہ ایک آزاد کردہ باندی تھی، اس نے عربی گرائمر کے اندر مہارت حاصل کی، اس نے مبرد کی ''الکامل'' اور الکعب کی ''النوادر'' پر حاشیہ بھی لکھا، اس کے شاگردوں میں ابوداؤد سلیمان کا نام بھی ملتا ہے۔

ولادہ بنت مستکفی مشہور شاعرہ ہے، اس کے گھر پر اندلس کے مشہور شعرا اور ادیبوں کا اجتماع ہوتا تھا، جس میں وہ خود بھی شریک ہوتی تھی، ولادہ انتہائی ذہین اور خوب صورت خاتون تھی، وہ اپنی بے باکانہ شاعری کی وجہ سے مشہور ہے۔(۱۸)

اندلسی خاتون نہ صرف علم وادب کے میدان میں مصروف کار نظر آتی ہے بلکہ سیاست کے میدان میں بھی اس نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، اس نے نہ صرف سیاست میں دل چسپی لی بلکہ اپنے بیٹوں اور خاوندوں کی سیاسی امور میں راہ نمائی بھی کی، عبدالرحمٰن ثانی جو کہ موسیقی اور عیش وعشرت کا دل دادہ تھا، اس نے امور سلطنت سلطانہ طروب کے سپرد کر رکھے تھے۔

لبانہ نہ صرف ایک شاعرہ تھی بلکہ وہ ایک فلسفی اور سیاست داں بھی تھی، جس کے افکار وسیع پیمانے پر پڑھے جاتے تھے، وہ حکم ثانی کی پرائیویٹ سکریٹری تھی، جب ۹۷۶ھ میں خلیفہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا جانشین ہشام ثانی ابھی کم عمر تھا تو امور سلطنت کی دیکھ بھال حکم کی بیوہ سلطانہ صبح کے ہاتھ میں تھی۔(۱۹)

یونان کے اندر جب یونانی تہذیب اپنے عروج پر تھی، اس وقت محض چند خواتین سیاست

اور تہذیب وتمدن کے اس مقام پر فائز تھیں جب کہ اس کے برعکس اندلس میں ایسی خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے۔(۲۰)

برطانیہ کے چارلس دوم کے عہد میں محض چند ایک خواتین لکھنا پڑھنا جانتی تھیں جب کہ اندلس میں آٹھ سو سال پہلے سینکڑوں خواتین علم وادب کے میدان میں نمایاں حیثیت کی حامل تھیں اور مردوں سے کسی طور پر کم نہ تھیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اندلس کے اندر خواتین نے اپنے بھائیوں اور شوہروں کے ساتھ مل کر علم وادب اور تہذیب وتمدن کی خدمت کی جس پر نہ صرف اہل اندلس بلکہ دنیا بھر کے مسلمان بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔

عیسائیوں سے رواداری

اندلس میں جب مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہوا تو ابتدائی زمانے میں اکثریت عیسائیوں کی تھی، مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں رواداری اور عدل وانصاف کا مظاہرہ کیا، اس لیے عیسائیوں نے مسلمانوں کی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں کلیسا کے ظلم وستم سے نجات حاصل ہوئی، مسلمانوں کے اعلا اخلاق اور مذہبی رواداری کو دیکھتے ہوئے بہت سے عیسائی امرا و شرفا مسلمان ہوگئے، کیوں کہ وہ ایک ایسے مذہب کو ترک کر رہے تھے جس کے دینی راہ نماؤں نے انہیں علم دین سے بے بہرہ رکھا تھا، ان کی دینی تربیت سے غفلت برتی تھی اور دنیاوی اغراض ومقاصد اور دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف ہوگئے تھے، اندلس کے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ بڑے پرجوش مسلمان ثابت ہوئے، عیسائیوں کی مذہبی قیادت اور ان کے ارباب کلیسا کا کیا حال تھا، اس کے بارے میں آرنلڈ لکھتے ہیں:

"At the time of the Muhammadan conwuest the old Gothic virtues are said by Christian historians to have declined and given place to effeminacy and corruption, so that the Muhammadan rule appeared to them to be a punishment sent from God on those who had gone astray into the paths of vice; but such a statement is too frequent

a commonplace of the ecclesiastical historian to be accepted in the absence of contemporary evidence.

But certainly as time went on, matters do not seem to have mended themselves; and when Christian bishops took part in the revels of the Muhammadan court, when episcopal sees were put up to a auction and persons suspected to be atheists appointed as shepherds of the faithful, and these in their turn bestowed the office of the priesthood on low and unworthy persons, we may well suppose that it was not only in the province of Elvira that Christians turned from a religion, the corrupt lives of whose ministers had brought it into discredit. and sought a more congenial atmosphere for the moral and spiritual life in the pale of Islam"(۲۱)

عیسائی مورخوں کا بیان ہے کہ اسلامی فتح کے وقت قوطی قوم کے (حکم رانوں کے) قدیم اخلاق واوصاف میں انحطاط آچکا تھا اور ان کی جگہ عیش پسندی اور بداعمالی نے لے لی تھی، چنانچہ انہوں نے اسلامی حکومت کو گویا ایک قہر خدا سمجھا ہے جو گم راہ لوگوں پر بہ طور عقوبت نازل ہوا تھا لیکن اس قسم کے بیانات کلیسا کے مورخوں کے ہاں بہت عام ہیں جن کو معاصرانہ شہادت کی عدم موجودگی میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وقت گزرنے پر بھی یہ حالات اصلاح پذیر نہیں ہوتے بلکہ عیسائی اسقف بھی دربار شاہی کی رنگ رلیوں میں شریک ہوگئے اور اسقف کے عہدے نیلام ہونے لگے، چنانچہ ایسے اشخاص بھی عیسائیوں کے پیشوا مقرر ہونے لگے جن پر منکرین خدا ہونے کا گمان تھا، پھر ان ہی لوگوں نے اپنی طرف سے مذہبی عہدے ذلیل

اور نااہل لوگوں میں تقسیم کردیے، ان حالات میں نہ صرف البیرہ میں بلکہ دیگر صوبہ جات میں بھی عیسائیوں نے اس دین سے روگردانی کی، جس کے پیشواؤں کی فاسقانہ زندگی نے اسے رسوا کردیا تھا، انہوں نے اس دین سے کنارہ کشی کر کے دائرہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی فضا کو اپنے لیے زیادہ سازگار اور موافق پایا۔

مسلمانوں کے ابتدائی دور میں کسی شخص کو جبراً مسلمان بنانے یا اس پر مذہبی تعصب کی بنیاد پر تشدد کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ملتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے عیسائی مذہب کے بارے میں رواداری کی جو روش اختیار کی تھی، اس نے ملک گیری میں ان کے لیے بڑی آسانی پیدا کردی تھی، نئے حاکموں سے عیسائیوں کو صرف اس بات کی شکایت ہوسکتی تھی کہ مسلمان حکام ان سے دیگر رعایا کی بہ نسبت مختلف سلوک کرتے تھے، ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا جو امیروں سے ۴۸ درہم، متوسط الحال لوگوں سے ۲۴ درہم اور پیشہ وروں اور مزدوروں سے ۱۲ درہم سالانہ کی شرح سے وصول کیا جاتا تھا، چوں کہ یہ جزیہ فوجی خدمت کے عوض میں لیا جاتا تھا اس لیے یہ صرف تندرست اور صحیح سلامت مردوں پر عائد ہوتا تھا، عورتیں، بچے، راہب، لنگڑے، لولے، اندھے، بیمار، فقیر اور غلام اس سے مستثنیٰ تھے، یہ جزیہ خود عیسائی عہدے دار جمع کرتے تھے، اس سے عیسائیوں نے اپنی دشواری اور گراں باری میں کسی قدر تخفیف ضرور محسوس کی ہوگی۔ (۲۲)

سوائے ایسے جرائم کے جو شریعت اسلام کے خلاف سرزد ہوں، عیسائیوں کے کل مقدمات ان ہی کے منصفوں کے سامنے اور ان ہی کے قانون کے مطابق طے کیے جاتے تھے، عیسائی لوگ اپنے مذہب کی پیروی کے سلسلے میں آزاد تھے، کوئی ان کو روکنے ٹوکنے والا نہ تھا، چنانچہ وہ قربانی دیتے تھے اور اس موقع پر بخور جلاتے تھے، ناقوس بجاتے تھے اور کیتھولک مذہب کی دیگر تمام رسومات کرتے تھے، گرجاؤں میں زمزمے گائے جاتے تھے، واعظین لوگوں کو اپنے وعظ اور خطبے سناتے تھے اور کلیسا کے سب تہوار حسب معمول منائے جاتے تھے، شام اور مصر کے عیسائیوں کی طرح وہ کوئی مخصوص لباس پہننے پر مجبور نہ تھے جو ان کی ذلت کی علامت سمجھا جائے، کم از کم نویں صدی عیسوی میں عام دنیادار عیسائی بھی عربوں کا سا لباس پہنتے تھے، ایک مرتبہ ان کو نئے گرجے تعمیر کرنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ (۲۳)

اسپین میں عیسائیوں کی بہت سی ایسی خانقاہیں تھیں جن میں عورتیں اور مرد بغیر مسلمان حکام کی مداخلت کے رہبانیت کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے علاوہ بھی چند جدید راہب خانوں کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے، راہب لوگ اپنے مذہب کے مخصوص اونی لباس میں باہر نکلتے تھے اور پادریوں کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ اپنے مذہبی منصب کی علامت کو چھپائیں، عیسائی عوام اپنے مذہب کی وجہ سے دربار کے اعلا عہدوں یا اسلامی فوج کی ملازمت سے محروم نہیں کیے جاتے تھے۔

اسپین کے جو عیسائی اپنی سیاسی قوت کے زوال کے بعد تسلیم و رضا کے خوگر ہو چکے تھے، ان کے لیے یقیناً کوئی وجہ شکایت موجود نہ تھی، چنانچہ اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ آٹھویں صدی کی تمام مدت میں صرف ایک بغاوت کا پتا چلتا ہے جو باجہ (Beja) کے شہر میں برپا ہوئی تھی اور اس میں بھی عیسائیوں نے ایک عرب سردار کی پیروی کی تھی، اسپین کے بعض لوگ کسی عیسائی حکومت کے زیر سایہ رہنے کے لیے فرانسیسی علاقے میں چلے گئے تھے لیکن ان کی حالت بھی اپنے ان ہم مذہب بھائیوں کی بہ نسبت بہتر ثابت نہ ہوئی جن کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے جب شاہ فرانس شارلیمن اسپین کی مہم (۷۷۸ء) سے ناکام لوٹا تو اسپین کے کچھ عیسائی اس کے ہم راہ فرانس چلے گئے، جب سرکاری اہل کاروں نے ان سے ٹیکس کی جبری وصولی شروع کی تو شارلیمن کو ۸۱۲ء میں ان کی حمایت میں مداخلت کرنی پڑی، تین سال کے بعد شاہ لوئی کو پھر ایک فرمان ان کے حق میں جاری کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود وہ پھر ان امرا کے خلاف شکایت کرنے پر مجبور ہو گئے جنھوں نے ان کی زمینیں ان سے چھین لی تھیں تاہم اس خرابی کا صرف ایک قلیل عرصے کے لیے سدباب ہو سکا، کیوں کہ یہ خرابی پھر نمودار ہو گئی اور وہ تمام احکام و فرامین جو ان کے حق میں جاری ہوئے تھے، بے سود ثابت ہوئے، کیوں کہ وہ لوگوں کی حالت کو بہتر نہ بنا سکے، بعد کے زمانے میں فرانس میں کاگوٹ (یعنی قوطی کتوں) کا جو حقیر اور مظلوم طبقہ دیکھنے میں آتا ہے وہ غالباً اسپین کے ان ہی لوگوں کی بستی تھی جنھوں نے اسلامی حکومت سے بھاگ کر اپنے آپ کو اپنے عیسائی بھائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

اندلس کی اسلامی حکومت نے اپنی عیسائی رعایا کے سلسلے میں جس رواداری اور بے تعصبی سے کام لیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین جو ملاپ بڑھا، اس سے دونوں قوموں میں ایک

حد تک یگانگت پیدا ہو گئی اور اکثر ان کے درمیان شادیاں ہونے لگیں، چنانچہ ایسی ڈور ساکن باجہ (Beja) جو مسلمان فاتحین کے خلاف بہت زہر اگلتا ہے، شاہ راڈرک کی بیوہ کے ساتھ موسیٰ بن نصیر کے بیٹے عبدالعزیز کی شادی کا حال لکھتا ہے لیکن اس کے قلم سے ملامت کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا، اکثر عیسائیوں نے عربی نام رکھ لیے تھے اور ظاہری رسم و رواج میں بھی ایک حد تک اپنے مسلمان ہم سایوں کی تقلید کرتے تھے، مثلاً بہت سے عیسائی ختنہ کرتے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں بھی انھوں نے مسلمانوں کی عادات اختیار کر لی تھیں۔ (۲۴)

حوالہ جات

(۱) ابن اثیر، ابوالحسن علی بن ابی الکرم، الکامل فی التاریخ، ۵ر ۱۸۳، دار صادر بیروت ۱۳۸۵ھ (۲) احمد امین، ظہر الاسلام، ۳ر ۲، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ ۱۹۶۲ء (۳) Arnold, The Preaching of Islam, p.139, Sheikh M. Ashraf, Lohore 1961 (۴) احمد امین، ظہر الاسلام، ۳ر ۸، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ ۱۹۶۲ء (۵) المقری، احمد بن محمد، نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، ۳ر ۱۵۹، دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء (۶) ایضاً حوالہ بالا، ۳ر ۱۶۶، ۱۶۷ (۷) المقری، احمد بن محمد، نفح الطیب، ۱ر ۲۸۰، دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء
(۸) Jayyusi, Salma Khadra, The Legacy of Muslim Spain, 1/188, E.J. Brill Leiden 1944
(۹) David Wasserstein, The Rise and Fall of the Party-Kings, p.195, Princeton University Press 1985
(۱۰) Ibid. p.199 (۱۱) Ibid, p.211
(۱۲) Jayyusi, The Legacy of Muslim Spain, 1/192, (۱۳) Mark R. Cohen, Under Cresent and Cross, the Jews in the Middle ages, New Jersey University Press 1994
(۱۴) ابن الخطیب، لسان الدین، الاحاطہ فی اخبار غرناطہ، ص ۱۳۲، اردو ترجمہ سعید اللہ ندوی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ (۱۵) میڈرڈ میں Computense University سے Amalia Zomeno نے اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے (۱۶) Jayyusi, The Legacy of Muslim Spain, 1/35-36 (۱۷) Ibid (۱۸) Ibid (۱۹) Ibid (۲۰) Ibid (۲۱) Arnold, The Preaching of Islam, p.134-5, Sheikh M. Ashraf, Lohore 1961 (۲۲) Ibid (۲۳) Ibid (۲۴) Ibid۔

☆☆☆☆☆

شبلی، شعرالعجم اور خواجہ حافظ شیرازی

از:- پروفیسر شعیب اعظمی ☆

علامہ شبلی نے نسبتاً کم عمر پائی، اس کے باوجود انہوں نے جو علمی کارنامے انجام دیے وہ اکثر طویل عمر پانے والے بھی نہیں انجام دے سکے، علی گڑھ، ندوۃ العلما میں درس و تدریس اور ندوہ میں نظم و انصرام، حیدرآباد اور ممبئی میں تصنیف کے میدان سے لے کر اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کے قیام، اسلامی تاریخ و علوم اور اکابر اسلام کے دینی اور علمی کارناموں، مسلمانوں کی تعلیمی بلندی اور پستی، الفاروق، سیرۃ النعمان اور سیرت مامون جیسی دستاویزی سوانح عمریاں، عربی ادبیات، علم کلام، غزالی اور مولانا جلال الدین رومی کے افکار اور آخر آخر میں سیرۃ النبی جیسی بیش بہا تصنیف کی داغ بیل ڈالنے کے علاوہ علوم اسلامی اور دنیائے اسلام کے تاریخی اور ادبی خزانوں سے متعلق بے شمار مقالے، سفرنامے، استقبالیے، خطبات، نظمیں، قصائد، مراثی اور فارسی کے دو دیوان، ان سب کے مقابلہ میں ان سے قبل و بعد نیز ہم عصروں کے کارناموں کو دیکھا جائے تو علامہ شبلی کے سامنے ان کی بے بضاعتی کا واضح اندازہ ہو جائے گا۔

ان کی علمی خدمات کا اعتراف اندرون و بیرون ملک میں اہل قلم اور خواص و عوام کے حلقوں میں خاطر خواہ ہوا، ان کی عربی اور فارسی تصانیف نے انہیں عالم اسلام میں بہ حیثیت عالم، دانش ور اور انشا پرداز، ادیب اور مورخ شہرت بخشی، ان کی مشہور کتابوں میں ایک مہتم بالشان کارنامہ شعرالعجم بھی ہے، جس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کرنا ہے کہ عالم اسلام اور علوم اسلام میں شامل فارسی زبان و ادب کی مکمل تاریخ، ایران کے مسلمان حکم رانوں اور ہندوستان کے مملوک سلاطین اور تیموری بادشاہوں کی سرکاری اور عوامی زبان فارسی کے مورخین، مصنفین اور خصوصاً شعرا کے حالات، خوبی کلام اور نقد و نظر کی کسوٹی پر ان کو کھرا اور کھوٹا بتاتے ہوئے ان کے علمی، ادبی اور

☆ سابق صدر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

شعری مرتبہ کا تعین، ایسا کارنامہ ہے، جس کی نظیر کم از کم ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔

اعظم گڈھ کے ایک معروف علمی قصبہ میں پیدا ہونے والے اس یگانہ خصوصیات کے مالک اہل قلم نے اپنی ان ہی تصانیف کی بہ دولت جس میں شعرالعجم خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، عربی اور فارسی دونوں کے دائرۃ المعارف کے لائق مرتبین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے علامہ شبلی کے حالات، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ادبی خدمات کا اعتراف اور اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کر کے انہیں بہ قول حافظ "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" کا مصداق بنا دیا، "الاعلام" میں خیر الدین زرکلی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

شبلی نعمانی: باحث من رجال الاصلاح الاسلامی فی الهند اعتنق الاسلام جده الثالث عشر سوراج سنگھ تسمی سراج الدین ولد شبلی فی قریة بندول من اعمال اعظم کر، تعلم فی رامبور ولاهور و سهارنبور وحج فاتصل بکثیر من رجال العلم وانتدبه موسس جامعة علی گر لتدریس علوم العربیة سنة الف وثلاث مأة عشر ۱۳۰۰ هجری فیها فکان عونا له علی النهوض بالجامعة وصنف کتباً جلیلة بلغته بعضها بالعربیة وشارک فی انشاء دارالعلوم التابعة لندوة العلما فی لکهنؤ وانشاء دارالمصنفین فی بلدة (اعظم کر) فانصدرت مئات

علامہ شبلی ہندوستان کے ایک محقق اور مذہبی مصلح تھے، ان کے اجداد کی تیرہویں پشت میں شیوراج سنگھ نے اسلام قبول کیا اور سراج الدین کے نام سے موسوم ہوئے، وہ ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے، رام پور، لاہور اور سہارن پور میں تعلیم پائی، اس کے بعد حج کیا اور حجاز کے اکثر علما سے ملاقات کی، ۱۳۰۰ھ میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (محمڈن کالج) میں عربی زبان کی تدریس پر مامور کیے گئے اور اس کی ترقی میں معاونت کی پھر دارالعلوم ندوۃ العلما کی تاسیس و تشکیل میں حصہ لیا اور اپنے وطن اعظم گڈھ میں دارالمصنفین قائم کیا، جہاں سے سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں اور مجلہ "معارف" نکل رہا ہے، دنیائے اسلام سے ان کے گہرے تعلقات تھے اور اس کی

من الکتب ولها مجلة اسمها
معارف" وکان وثیق الصلة بالعالم
الاسلامی ونهضاته السیاسیة
والاجتماعیة وماکتبه بالعربیة
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی
لجرجی زیدان، الجزیة وکان یجید
العربیة والفارسیة مع الهندیة ۔(۱)

سیاسی و اجتماعی بیداری اور ترقی سے خاص
دل چسپی تھی ، ان کی عربی تصنیفات میں
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی لجرجی
زیدان اور الجزیہ وغیرہ ہیں اردو کی طرح
عربی وفارسی کے بھی ماہر تھے۔

فارسی زبان کے مشہور دائرۃ المعارف "لغتنامہ دھخدا" میں بھی زرکلی کے حوالہ سے یوں
لکھا ہے:

شبلی نعمانی ملقب بہ شمس العلماء، مورخ
ادیب نویسندہ شاعر مصلح اسلامی ہند، محقق
و برہمنی الاصل[1]، جد سوم[2] او سوراج سنگ
معروف بہ سراج الدین اسلام آورد، شبلی
نعمانی در قریہ بندول از توابع اعظم گر بسال
۱۲۷۴ھ پائی بدنیا گزارد، دورہ تحصیلات را
در رام پور و لاہور و سہارن پور گردانید و بہ حج
رفت و در سال ۱۳۰۰ھ دانش گاہ[3] علی گر
تدریس ادبیات ادبی مینمود و در اشاعہ فرہنگ
وادبیات مجدانہ اقدام می کرد و زبان عربی و
فارسی راخوب میدانست از آثار اوست شعر العجم،
انتقاد تاریخ تمدن اسلامی جرجی زیدان، جزیہ

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مورخ ، ادیب ،
مصنف، شاعر و محقق اور ہندوستان کے اسلامی
مصلح تھے ، برہمن نژاد تھے ، ان کی اوپر کی
تیرہویں پیڑھی میں شیوراج سنگھ اسلام لائے
جو سراج الدین کے نام سے موسوم ہوئے ،
اعظم گڈھ ضلع کے گاؤں بندول میں ۱۲۷۴ھ
میں پیدا ہوئے ، تحصیل علم کے لیے رام پور،
لاہور اور سہارن پور تشریف لے گئے ، پھر
حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور ۱۳۰۰ھ
میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں ادبیات کی تدریس
پر مامور ہوئے اور زبان وادبیات کے فروغ
واشاعت میں سرگرم رہے ، ان کو عربی وفارسی

[1] برہمنی الاصل کے بجائے راج پوت نسل سے تھے "ض"۔ [2] غالباً سیزدہم ہوگا۔ [3] یونی ورسٹی کے بجائے اس وقت کالج تھا۔

مجلہ معارف ، شبلی در سال ۱۳۳۲ھ در
گذشت ۔(۲)

زبان پر عبور تھا ، ان کے کارناموں میں
شعر العجم ، انتقاد تاریخ تمدن اسلامی ، جزیہ
اور مجلہ معارف وغیرہ ہیں ، ۱۳۳۲ھ میں
وفات پائی۔

شہرۂ آفاق کتاب شعر العجم کا ذکر خاص طور پر ہے ، فارسی ہی کے ایک دوسرے مستند
دائرۃ المعارف ریحانۃ الأدب کے صفحات میں بھی شبلی کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے
لکھا ہے:

شبلی نعمانی ہندی در اوائل قرن حاضر چہار
دہم ہجرت از علمائی اسلامی ہند بود ، در
بلاد اسلامی سیاحتہا کردہ و از مقتضیات ،
اطلاعات کافی بہم رسانید ، ہر سہ زبان
فارسی وعربی و ہندی راخوب میدانست و
از تالیفات اوست : ۱- انتقاد کتاب تاریخ
تمدن اسلامی جرجی زیدان کہ در قاہرہ
چاپ شدہ است ، ۲- تاریخ عمر بن خطاب
۳- کتاب الجزیہ کہ در ہند چاپ شدہ
است ، نعمانی در سال ہزار وسی صد و دویم
ہجری درگذشت ۔(۳)

علامہ شبلی نعمانی چودہویں صدی ہجری کے
اوائل میں ہندوستان کے علمائے اسلام
میں تھے ، انہوں نے اسلامی ممالک کی
سیاحت کی تھی اور وہ زمانے کے حالات
اور تقاضوں سے بہت باخبر تھے ، ان کی
تصنیفات میں انتقاد تاریخ تمدن اسلامی
جرجی زیدان ، تاریخ عمر بن الخطاب
(الفاروق) اور کتاب الجزیہ ہے جو
ہندوستان میں چھپی ہیں ، ۱۳۳۲ھ میں
انتقال ہوا۔

اسی طرح دوسرے لغات ، فرہنگ سخنوران اور تذکروں میں شبلی کے نام کے علاوہ ان
کی اس شعری تنقید و تذکرہ پر بڑے بڑے ایرانی اہل قلم نے تعریفی کلمات لکھے ہیں اور شبلی کے
اشعار منتخبہ اور اقتباسات سے اپنی تصانیف کو قابل قدر بنایا ہے ، ایران کے مایہ ناز ادیب اور
مورخ دکتر ذبیح اللہ صفا نے اپنی فارسی ادب کی تاریخ "تاریخ ادبیات فارسی در ایران" میں امیر
خسرو ، سلمان ساوجی اور حافظ شیرازی کے کلام کی طویل گفتگو میں آٹھ جگہوں پر شبلی کے نقطہ نظر

سے اتفاق کیا ہے، اسی طرح حال ہی کے ایک تذکرہ نگار احمد گلچیں معانی نے ''کاروان ہند'' میں جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، شبلی اور شعرالعجم کا بار بار ذکر کیا ہے، جہاں گیر کے درباری شاعر طالب آملی، عرفی، کلیم ہمدانی اور شاپور تہرانی کے کلام سے بحث کرتے ہوئے ان کے جن بعض اشعار کو دوسرے شاعر سے منسوب کردیے ہیں، ان سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا ہے مگر نہایت احترام اور خلوص کے ساتھ احمد گلچیں معانی نے شعرالعجم سے متعلق اپنی کتاب میں تقریباً پانچ حوالے پیش کیے ہیں۔

اسی طرح اُستاد، ہ، توفیق سبحانی کی ضخیم تاریخ نگاہی'' بہ ادبیات فارسی ہند'' کے صفحات بھی شبلی اور شعرالعجم کی افادیت اور اہمیت کے ذکر سے خالی نہیں ہیں، شعرالعجم کی شہرت اور عظمت کا ڈنکا اس وقت بجا جب ایران کے ایک موقر اور مستند ادیب اور مترجم آقائی فخر داعی گیلانی نے شعرالعجم کا مکمل اور کامیاب ترجمہ کرکے ہر ایرانی کے کان میں شبلی اور شعرالعجم کی مٹھاس گھول دی۔

ان کے خیال میں ''ایسی جامع کتاب آج تک اس فارسی زبان میں جو ایرانیوں کا زندۂ جاوید اور ناقابل فنا ملی خزانہ ہے نہیں لکھی گئی ہے''۔(۴)

انہیں فخر داعی گیلانی کے ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے آقائی سعید نفیسی شبلی اور شعرالعجم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ فارسی ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ہمیشہ رہنما اور روشنی بخش ثابت ہوگی، کیوں کہ شبلی نے اپنی کتاب میں اپنی نقادانہ موشگافیاں اور مہارت ظاہر کردی ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ایران سے بہت دور ہو اور جس نے کبھی ایران کی سرزمین پر قدم نہ رکھا ہو اور نہ ہی اسے اہل زبان کے ساتھ نشست و برخاست میسر رہی ہو، اس زبان کے رموز سے اس قدر آشنا ہو وہ اس کی مشکلات کے بارہ میں اپنی صائب رائے کس طرح دے سکا ہوگا، سعید نفیسی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> کسانیکہ کارشان بحث و فحص در ادب فارسیست می دانند کہ ایں کتاب ہموارہ راہبر و روشن بین ایشان درین راہ دشوار خواہد بود شبلی درایں کتاب استادی خود در نقادی و موشگافی آشکار کردہ است و راستی جائی شگفتگی است کہ دور از ایران کسی کہ پا بہ ایران نگذاشتہ و با فارسی زبان آمیزش شبانروزی نداشتہ است بدینگو نہ بہ رموز ایں زبان آشنا بودہ و تا ایں اندازہ آرا، صواب در بارہ ایں دشوار یہا بیان کردہ باشد''۔(۵)

> امتیاز ایں کتاب سودمند پر مغز اینست کہ نخستین دفتریست کہ مرد دانا و روشن بین در تجزیہ و تحلیل در وگراں بہائے ایں خزانہ جاودانی کہ ادب پارسی باشد، پرداختہ است و بحکم الفضل للمتقدم'' ہموارہ نام شبلی را زندہ نگاہ خواہد داشت چیزی کہ برارزش ایں کتاب در دیدہ ایرانیاں بیشتر میافزاید اینست کہ مولف بزرگوار ایں دفتر جاودانی ہمہ جا بابیانی بسیار آشکار و دوست داری وحتی شگفتگی خود را نسبت بزبان فارسی و گویندگان و سرایندگان ایں زبان نشان میدہند۔

شبلی نے شعرالعجم میں نقد و نظر کے جو اصول متعین کیے تھے اور ان کی روشنی میں شعرائے مذکورہ کے کلام پر جس طرح بحث کی تھی وہ فخر داعی گیلانی کی نظر میں معتبر اور معیاری ہے، چنانچہ شعرالعجم کی تیسری اور چوتھی جلد میں اس طریقہ کار کا حق ادا کیا، اس کے بارے میں محترم مترجم لکھتے ہیں:

> ''شبلی در ہر یک ازیں سہ بخش مختصات شاعری دورہ مربوط را مورد بحث قرار دادہ و بعد از شرح احوال چند تن از مشاہیر شعرا، محصولات فکری یا تراوشات طبع ہر یک را با اصول انتقاد علمی تحت سنجش و آزمایش آوردہ، محسنات و معائب آں را کماہو حقہ معلوم داشتہ است''۔(۶)

شبلی کے ہم عصر براؤن کے نام سے کون آشنا نہیں ہے؟ پروفیسر موصوف کی ''تاریخ ادبیات ایران'' اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں، شبلی جس زمانہ میں شعرالعجم کی ترتیب و تالیف میں مصروف تھے، براؤن کی کتاب بازار میں آئی، شبلی بہت فکرمند تھے، چنانچہ انہوں نے یہ کتاب جو انگریزی میں تھی اپنے بھائی مہدی سے پڑھوا کر سنی تو خوش بھی ہوئے اور براؤن کی بعض خامیوں پر افسردہ بھی۔خوش اس لیے کہ بہ قول شبلی ''میرے شعرالعجم کو ہاتھ نہیں لگایا'' اور افسردہ بھی کہ ''حضرت نے فردوسی پر فقط چند صفحات پر اکتفا کی''، انہیں پروفیسر براؤن کی کتاب (از سعدی تا جامی) جو شبلی کے انتقال بعد شائع ہوئی اور جس میں براؤن نے شعرالعجم کی خوبیوں

اور افادیت کا اعتراف جگہ جگہ کیا ہے، اس کتاب کا فارسی ترجمہ بیسویں صدی کے مشہور و معروف مصنف، مورخ، مترجم، عالم و فاضل، شاعر، سیاست داں، آقائی علی اصغر حکمت نے کیا ہے، حکمت آزاد ہندوستان میں ایران کے پہلے سفیر، یہاں کے علمی اور سیاسی حلقوں میں مقبول ''سرزمین ہند'' اور ''شعر فارسی براجار ہند'' جیسی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، شبلی کی شعر العجم اور اس کی خوبیوں سے کس طرح بے خبر رہ سکتے تھے؟ گرچہ شعر العجم کا ترجمہ غالباً اس وقت تک نہیں ہوا تھا مگر ان کی ادب شناس نگاہ براؤن کی کتاب کے ذریعہ شعر العجم کی افادیت کو اچھی طرح پہچان گئی تھی، چنانچہ انہوں نے لکھا:

''کسانی را کہ میتوانند زبان اردو، بخوانند باید متوجہ بنمود بکتاب بسیار نفیس و عالی موسوم بہ شعر العجم بقلم مرحوم شبلی نعمانی کہ جدیداً تالیف شدہ در سال ۱۹۰۷ء در دو جلد در علی گر- و مشتمل است بر تتبعات و انتقادات دو بارہ بیست تن از شعرائی کلاسیک ایران از فردوسی و اخلاف او تا حافظ شیرازی''۔ (۷)

چنانچہ براؤن نے تقریباً ۱۲ جگہوں پر اپنی رائے لکھتے ہوئے شبلی اور شعر العجم میں شعرا کے ذکر اور کلام کے حسن و قبح کے بارے میں خاص طور سے اشارے کیے ہیں، کتاب مذکور کے صفحہ ۲۹۰ اور ۲۹۴ پر سعد سلمان کی شاعری پر شبلی کے خیالات کی تصدیق کی ہے، صفحہ ۲۹۶ پر سلمان کے قصائد اور غزلیات کی مشکل گوئی پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔

خواجہ حافظ کی شاعری پر شبلی کے قابل ستایش تبصرہ اور کلام کی جزوی بحث پر براؤن نے اپنی کتاب کے صفحات ۲۹۹، ۳۰۰ اور ۳۰۲ پر اس طرح لکھا ہے:

''بہترین و کامل ترین مطالعات محققانہ ای کہ در بارہ حافظ بہ عمل آمدہ آنچہ اطلاع دارم ہمانا در کتاب شعر العجم است کہ شبلی نعمانی بزبان اردو نگاشتہ و کرارا از آں نقل نمودہ ایم''۔ (۸)

اسی طرح صفحہ ۳۱۲ پر سلطان غیاث الدین اسکندر بنگالی کا ۷۶۸ھ/۱۳۶۶ء حافظ شیرازی کو ہندوستان مدعو کرنے، حافظ کی معروف غزل ''ساقی حدیث سرو گل ولالہ'' کا حوالہ دینے اور اسی طرح حافظ کے ممدوح سلاطین شاہ شجاع، شیخ ابو اسحاق، سلطان محمود اور شاہ منصور کی

شان میں مدح سرائی کرنے اور آخر آخر میں صفحہ ۳۱۸ پر حافظ کی شاعری کا موازنہ سعدی، سلمان ساوجی، امیر خسرو اور حسن دہلوی سے کرتے ہوئے کارآمد گفتگو کی ہے۔

علامہ شبلی کے اس قدر زیادہ علمی اور ادبی کارناموں، شعر العجم کی اس درجہ قدر و منزلت کے باوجود ہمارے یہاں حافظ محمود خاں شیرانی، عبدالحلیم شرر، عبدالرزاق کان پوری، مولوی عبدالحق اور شیخ محمد اکرام کی نظروں میں آزاد کی ''آب حیات'' و ''سخندان پارس'' اور حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے مقابلے میں کم تر اور ان بزرگوں سے مستعار ہیں، بعض کتابیں شبلی کی نہیں بلکہ ان کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کے قلم کی مرہون منت ہیں اور یہ کہ ان کا مرتبہ محسن الملک سے بھی کم تر تھا، یہی نہیں بلکہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے اردو دائرۃ المعارف کے صفحات میں شبلی کی تنقید کو تاثراتی اور جمالیاتی قرار دیتے ہوئے اسے عہد تداخل کی تنقید کا نام دیا ہے اور شعر العجم کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے:

''شعر العجم میں شعر و شاعری، جذبہ اور خیال کی بنیادی اہمیت کا اعتراف ہے مگر ہر شاعر کی شاعری کے جائزے بعض اوقات اتنے یک رنگ ہو جاتے ہیں کہ مختلف شاعروں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔ (۹)

ان بے جا اعتراضات کا جواب علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی سے لے کر مہدی افادی اور عبداللطیف اعظمی کی تصنیفات میں اطمینان بخش طور پر دیا جا چکا ہے، اس لیے آیندہ صفحات میں شعر العجم میں شبلی کی شعر فہمی، شعر سنجی اور شعر گوئی اور شعر شناسی کی بہترین مثال لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کے کلام پر نقد و نظر کے سلسلہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی جس کے بارہ میں آقائی علی اصغر حکمت نے بہت واضح اشارہ کیا ہے اور مہدی افادی نے شبلی کی شاعرانہ ہی نہیں بلکہ پیمبرانہ وجدان کا لوہا منوا کر معاندین شبلی کا منہ بند کر دیا ہے:

''اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوق صحیح پر منحصر ہے اور ان کی خوبیوں کا دکھانا بڑے اہل کمال کا کام ہے تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہ شاعری کے ملکہ راسخہ اور ادبی نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقین یورپ

بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے''۔ (۱۰)

شبلی کی شعر گوئی اور وہ بھی فارسی میں بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، کتابوں میں لکھا گیا ہے اور شبلی نے اس کی تصدیق بھی کی ہے کہ ان کے اس شوق کو جلا بخشنے میں مولانا فاروق چریاکوٹی کی تشویق اور استادی کارفرما تھی، ہمیں یہ بات کہیں بھی لکھی ہوئی نہیں ملتی کہ ان کے استاد نے انہیں فارسی کے کن کن بڑے اساتذہ کا کلام پڑھایا، صنف شعر میں قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ اور غزل کے میدان میں کن اصولوں سے آگاہ کیا، کیوں کہ شبلی نے حماسہ، رزمیہ، بزمیہ، رثائیہ، قطعات، رباعی اور غزل کے ممتاز شعرا میں فردوسی سے لے کر کلیم اور طالب تک کو لیا ہے اور ان کی مخصوص صنف شعر میں گفتگو کی ہے اور ان کی خوبیاں ثابت کرنے کے ساتھ اپنی مہارت اور استادی کی نشان دہی بھی کی ہے، فارسی کے معروف شعرا میں نظامی، خیام، سنائی، عطار، رومی، خواجو، سلمان ساوجی، سعدی، حافظ، عرفی، صائب، نظیری ہیں جن میں بیشتر غزل گو کی حیثیت سے مسلماً تسلیم کیے جاتے ہیں، سوانح مولانا روم میں فیہ مافیہ، مثنوی معنوی اور دیوان شمس کی خصوصیات بیان کرتے وقت مولانا شبلی کی فارسی دانی اور رومی جیسی شخصیت کی شاعرانہ عظمت لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں، خیام کی عارفانہ مستی، سنائی اور عطار کی متصوفانہ تفصیل و تشریح، سعدی اور خواجو کی عاشقانہ نکتہ سنجیاں اپنی جگہ سہی مگر جو شغف اور شیفتگی انہوں نے خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کی توجیہ و توضیح میں دکھایا ہے وہ کسی اور شاعر کے ذکر میں نظر نہیں آتا ہے۔

شبلی نے حافظ کے حالات زندگی معلوم کرنے میں کوتاہی نہیں کی، اس وقت کیا اب بھی حافظ کے صحیح اور مفصل حالات معلوم کرنا آسان نہیں، یہ حافظ کی غزلیات کی سرمستی، رمز آشنائی، عرفان شناسی، وجد آفرینی، ترنم آمیزی اور بے نیازانہ و رندانہ بلانوشی تھی جس سے ان کا کلام بھرا پڑا تھا، جو'' دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم'' صاحب فن والے شبلی کو اپنی طرف کھینچے بنا نہ رہ سکی، شبلی کو عمر کے آخر میں پناہ ملی بھی تو کہاں جہاں انہیں سکون، خاموشی اور لکھنے پڑھنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا، بمبئی کی چوپاٹی اور اپالو دیکھ کر کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی حافظ یاد آ گئے تو انہوں نے دیوان حافظ کی سیر شروع کر دی، ۱۹۰۶ء سے حافظ کے میخانہ میں داخل ہوئے اور ۲ر فروری ۱۹۰۸ء کو خواجہ کے دربار سے رخصت ہوئے اور پھر اپنی شعر العجم کے لیے اس بے مثل شاعر

پر اپنے صحیح مذاق شعری اور فکر رندانہ کا ایک گلدستہ پیش کر دیا۔

شبلی واقعتاً ایک دربار سے رخصت ہوئے تھے، حافظ کا شیراز، شاہ شجاع امیر مبارز، اسحاق اینجو، شاہ منصور اور بادشاہ مظفر کا پایہ تخت اور ان بادشاہوں کے شب و روز نبرد آزما ہونے کے باوجود بہشت روئی زمین خیال کیا جاتا تھا، باغوں، چشموں، رباطوں، عارفین و زہاد کا شہر تھا، مدرسوں، تکیوں اور عمارتوں کا شہر تھا، مدرسہ مجدیہ، مدرسہ خاتونیہ، مدرسہ شاہ محمود، رباط شیخ کبیر تشنگان علم کا مرکز تھے، مفتاح سکاکی، حاوی، مواقف قاضی عضد، عوارف المعارف شہروردی، زمخشری کی کشاف، قرامت ہفت گانہ، عشرہ روایت، حفظ قرآن، قصیدہ شاطبی کا درس، قاری ابوالمبارک ابوالخطاب، مشہور خطاط جلال عضد اور سہل، شافعی المذہب لوگ اور حافظ کے استاد قوام الدین عبداللہ بھی تھے۔

حافظ اسی ماحول میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان سعدی کی مانند عالمان دین کا نہ تھا لیکن خوش حال ضرور تھا، حافظ نے باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی، حافظ قرآن تھے، شیراز کے بزرگوں اور خاندانی لوگوں کو خواجہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، حافظ کے نام کے ساتھ خواجہ کا سابقہ ان کے خاندانی شرف کی دلیل ہے۔

یہ حافظ کے سن بلوغ کا زمانہ تھا، نان بائی کی دکان پر خمیر گیری کرنا شعر کی ناپختگی پر دوسروں کے ہنسنے کی وجہ سے بابا کوہی کے مزار پر شب بیداری اور دعا مانگنے پر اچھے شعر کا واقعہ شبلی نے بیان کیا ہے مگر یہ ایک افسانہ ہے، نجم الدین نامی ایک شخص نحو و صرف کا عالم اور زاہد صفت شخص منظوم شہادتیں پیش کرنے میں ماہر تھا اور پیشہ سے خبازی کرتا تھا، چنانچہ طالب علم اس کی اس خوبی کی بنا پر اس کی دکان پر روٹی بھی کھاتے تھے اور علمی دل چسپی بھی حاصل کرتے تھے، غالباً حافظ بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔

شیرازی پر کیا موقوف کم از کم فارسی شاعری کی تاریخ میں اس خباز کی مانند، اطعمہ بواسحاق، البہ ادریس، بہرام سقہ، حلوائی اور کلچہ پز تخلص والے شعرا صاحب دیوان گزرے ہیں، اسی طرح شمس الدین نامی ایک اور شاعر قرآن و حدیث کا عالم راست گوئی میں مشہور تھا، جس کی روشنی میں لوگ اسے شمس الدین صادق کہتے تھے، ممکن ہے افسانوی شکل میں خواجہ شمس الدین حافظ کے نام

سے اشتباہ پیدا ہو۔

بہر حال حافظ زمانہ کودکی سے شعر کہتے تھے، ایک بار ان کی سواری کا خچر مسعود شاہ کے آدمیوں نے چرا لیا تھا، حافظ نے شہر کے نگراں کے نام ایک رندانہ منظوم شکایت نامہ لکھ بھیجا تھا، یہ منظومہ ان کے دیوان میں موجود ہے جو اوائل عمر کی شعر گوئی کا نمونہ ہے۔

حافظ کا مذہبی، علمی اور تہذیبی شیراز ایک اچھے اور باکمال شاعر کو مناسب مواد فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ تھا، مکتبوں، مدرسوں، معلموں، درسی کتابیں اور مساجد کے ساتھ میخانے، کلوؤں اور پہلوانوں کی دھاندلی جو قاضیوں، مفتیوں، عمال شہر اور حاکمان وقت ہی کیا امرا اور وزرا کے عروج و زوال کا باعث ہوا کرتی، کریم الطرفینی، شرب الیہود کی عادت کے باوجود، جید عالموں، سرکاری قاضیوں، مفتیانِ دین کے درمیان، خانقاہیں، عرفان و تصوف و مشیخت کے مراکز، زندگی کے نشیب و فراز، تنگ دستی، عزلت، خستہ دلی ہی نے حافظ کو حافظ نہیں بنایا بلکہ سامانوں سے اور میووں سے بھرے بازار، خوش مزاج، خوش پوش، شایستہ طبیعت شیرازی، زنانہ مخملیں چادر میں سراپا ملبوس، عفت، پاکیزگی کا نمونہ، ہاتھوں میں پنکھے، پیر، موزوں اور جوتوں سے محفوظ طوطیان شیراز، شوخ و شیریں کار شہر آشوب"، ماضی میں سعدی شیرازی اور بعد میں حافظ شیرازی کی غزل میں ڈھل گئے، دیوان حافظ کی ۵۰۰ غزلیات، ترجیع بندوں قصائد اور رباعیات ہیں، قرآن، تفسیر، حدیث، اہل مدرسہ کی اصطلاحات، تاریخ، عربی دانی، قصیدہ بردہ و بوصیری، متنبی شریف یمنی، ابن فارض، ابونواس، ابوالعلامعری، فارسی میں رودکی، فردوسی، خیام، نظامی، انوری، ظہیر، کمال اسماعیل، سلمان ساؤجی، سعد سلمان، سنائی، عطار، رومی، سعدی کے کلام کی خوبیوں کے ساتھ، سلاطین وقت، مورخین، وزرائے اعظم، عطاملک جوینی، صاحب دیوان وغیرہ کا حوالہ، ان کے علم و فضل کا بین ثبوت ہے۔

شاعر اور صاحب فن، رند اور ندیم شبلی نے دیوان حافظ کی شستہ اور موسیقی سے مملو غزلوں میں حافظ جاوداں کو ڈھونڈ نکالا اور ان کے ہر رنگ، ہر خیال اور شاعری کی ہر پرت کو بہ غور پڑھا اور ان کا عنوان لکھ کر ان ہی کے اشعار کی روشنی میں ان کی فکر اور عطر کو اس خوب صورت انداز میں پیش کیا جس کی گیرائی، گہرائی اور خوش بو سے حافظ شیرازی کے شیدائیوں کے مشام

جان معطر ہیں، خانقاہوں سے درباروں تک، عوام سے خواص تک، مشرق کے علما کی مجالس سے لے کر مغربی دانش مندوں کی ادبی محفلوں تک حافظ ہی کا ذکر ہے، تراجم، شرحیں اور مصور دیوانِ حافظ آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں موجود ہیں اور شبلی کا نام نامی بھی، سودی سروری، شمعی اور مشہور جرمن شاعر گوئٹے کی صف میں شامل ہے۔

شبلی نے خواجہ حافظ کی شاعری کو معجزہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"خواجہ حافظ کا ایک خاص معجزہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن ان کی غزل کی لطافت میں کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ علمی اور فلسفیانہ اور دقیق قسم کے خیالات ان کی غزلوں میں زیادہ دل چسپ ہو جاتے ہیں، خواجہ حافظ نے ایک طرف غزل کو اتنی پہناوری عطا کی کہ اخلاق، فلسفہ، تصوف، پند و موعظت، سیاست، ہر قسم کے مضمون کو اس میں داخل کیا اور دوسری طرف فارسی زبان کی خصوصیات کو بھی یعنی لطافت، شیرینی، رنگینی اور ظرافت جو اس میں بہ قدر ضرورت بیان ہو سکے کی رعایت ملحوظ رکھی"۔ (۱۱)

حافظ سے شبلی کی بہت زیادہ اور بے حد شیفتگی اور غزلوں سے غیر معمولی شغف نے ان کی شاعرانہ طبیعت کو غزل گوئی کی طرف اتنا متوجہ کیا کہ باوجود دیگر اسباب کے ان کی غزلوں کے دو دیوان "بوئے گل" اور "دستۂ گل" ان کی پیری کے دور میں وجود میں آئے، یہ دل چسپ بات ہے کہ ان کے دیوانوں کی ۲۶ غزلوں کے مقطعے حافظ کی غزلوں کی یاد دلاتے ہیں:

پیش ازیں گام طلب در رہ حرمان زدہ ام	بمبئ بود ترا منزل مقصود عبث
طراز خلخ و نوشاد و فرحا راست پنداری	زہے جان بخشی آب و ہوائی بمبئ شبلی
دامن بمبئ از کف ندہم تا باشم	دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی
طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را	نثار بمبئ کن ہر متاعی کہنہ و نورا
ما نیز با تو ہم سفریم این شتاب چیست	شبلی عنان گسستہ مرو سوئی بمبئ
کہ در آشوب گاہ بمبئ در باز و ایمان را	ز ذوق طبع شبلی من اول روز دانستم
باش تا بادۂ این میکدہ در جوش آید	این غزل اول فیض اثر بمبئ است

در حیرتم کہ پائی گفتارش از کجاست
شبلی مگر ز مردم ہندوستان نبود

شبلیا آں جلوۂ نیرنگ ہائے بمبئی
بود تا وقتے کہ من خواب گرانی داشتیم

داغم کہ بہار چمن بمبئی امسال
بر عادت پیشینہ جنوں خیز نبودہ است

شبلی حافظ کے سامنے، خیام، سنائی، رومی، نظیری، صائب اور علی حزیں کو بھلا بیٹھے، انہیں حافظ کی ایمائیت، عرفان اور حسن و عشق کی آمیزش نے مجازی دنیا سے نکال کر بسا اوقات معشوق حقیقی کے دربار میں پہنچادیا، چنانچہ ذیل کی غزل پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شبلی نہیں حافظ کی غزل ہے:

صوفی آں سرّ حقیقت کہ ہویدا می کرد
ہر حدیثی کہ بما کرد ہم از ما می کرد

پیکر آرائی ازل طلعت زیبائی ترا
نقش می است وہم از ذوق تماشا می کرد

بر گذرگاہ چمن عطر فروشی سحری
بوئی زلف تو بکف داشت کہ سودا می کرد

فلسفی سرّ حقیقت نتوانست کشود
گشت راز وگرآں راز کہ افشاء می کرد

بہ مسیحا نفسی آں لب اعجاز نمائی
مردہ را زندہ ہمی کرد و بدعوئ می کرد

مایہ برہمی ہر دو جہاں گشت آخر
فتنہائی کہ قد و زلف تو بالا می کرد

شبلی از قامت و بالائی تو می کرد سخن
یا مگر خود سخن از عالم بالا می کرد

آقائی فخر داعی گیلانی نے شبلی کے تعارف میں ان کی شخصیت کا جو سراپا کھینچا ہے، وہ شبلی کی فارسی دانی اور حافظ شناسی کا بین ثبوت ہے اور شبلی کی مذکورہ بالا غزل جس غزل سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، اس کے اشعار کا حوالہ شبلی کی فارسی غزل پر دال ہے:

"باہمہ علوم بی حد متواضع، بی تکلف، وارستہ و بی آلایش بود، نشاط روحی وی حیرت انگیز بود، در ظرافت طبع، بذلہ گوئی، حسن محضر و لطف بیان تطہیر نداشت، شعر را زیاد دوست میداشت، شعر خوب در وجود او از ہر چیز بیشتر تاثیری بخشید، یک روز یادم می آید در اثنائی صحبت ایں شعر خواجہ را خواند

مشکل خویش بر پیر مغاں بردم دوش
کو بتائید نظر حل معما می کرد

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست
وندراں آئینہ صد گونہ، تماشا می کرد

گفتم ایں جام جہاں بین بتو کی داد حکیم
گفت آں روز کہ این گنبد مینا می کرد

دیدم حالت وجدی بوی دست داد کہ سراپائی وجودش را باہتناز در آورد بعد تبسمی فرمود، اگر ایران را بمن بدہند آں قدر کیف نمی کنم بقدریکہ ازیں سہ شعر لذت بردہ کیف می کنم"۔ (۱۲)

حواشی

(۱) الاعلام، الجزء الثالث، طبع ثامن، ص ۲۲۷، بیروت، جولائی ۱۹۸۹ء (۲) دکتر محمد معین، لغتنامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۷۳، تہران، ۱۳۴۰ ہجری شمسی (۳) استاد علامہ محمد علی مدرس، ج ۳، طبع دوم، ص ۱۸۳، کتاب فروشی خیام، تہران، ۱۳۴۶ ہجری (۴) سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، شعرالعجم مترجم (دیباچہ)، تہران، ۱۳۳۶ شمسی (۵) ایضاً (مقدمہ) (۶) ایضاً (دیباچہ) (۷) علی اصغر حکمت، از سعدی تا جامی (ترجمہ براؤن)، ص ۱۳۲-۱۳۱، تہران، ۱۳۲۷ھ/۱۹۴۸ء (۸) ایضاً (۹) دانش گاہ پنجاب لاہور، دائرۃ المعارف اسلامی، ج ۱۱، ص ۲۰۳، طبع اول، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء (۱۰) بیگم مہدی، افادات مہدی، ص ۲۰۰، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۳۹ء (۱۱) شبلی نعمانی، شعرالعجم، ج ۳، دارالمصنفین، اعظم گڈھ (۱۲) سید محمد تقی فخر داعی گیلانی، (شعرالعجم)، ج ۳ و ۴، تہران، ۱۳۲۶ ہجری۔

کتب استفادہ

۱- احمد گلچین معانی، کاروان ہند، ج ۱، چاپ انتشارات آستانہ قدس رضوی، مشہد، ۱۳۶۹ شمسی۔

۲- پروفیسر خورشید نعمانی، دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، ج ۱، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۳ء۔

۳- پروفیسر شہریار، فکر و نظر، شبلی نمبر، علی گڑہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑہ، ۱۹۱۶ء۔

۴- حافظ محمود خان شیرانی، تنقید شعرالعجم، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۲ء۔

۵- دکتر ہ - ج - توفیق سبحانی، نگاہی بتاریخ ادب فارسی در ہند، شورائی گسترش زبان و ادبیات فارسی، تہران۔

۶- دکتر ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، طبع ۴، انتشارات فردوس خیابان مجاہدین، تہران۔

۷- دکتر ع، خیامپور، فرہنگ سخنوران، شرکت سہامی، چاپ ایران، تبریز آبانماہ، ۱۳۴۰ شمسی۔

۸- عبدالحسین زرینکوب، از کوچہ رندان، موسسہ انتشاراب، امیر کبیر ایران، ۲۵۳ ہشاہی۔

۹- شیخ محمد اکرام، یادگار شبلی، طبع ۲، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب
''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب''

از:- جناب محمد عبدالقدیر صاحب ☆

''ڈاکٹر گیان چند جین کی مذکورہ بالا کتاب پر جناب شمس الرحمن فاروقی کے علاوہ بھی بعض اور اہل قلم اظہار خیال کر چکے ہیں مگر فاروقی صاحب کا مضمون لاجواب ہے اور وہ بہ کثرت رسالوں میں چھپا ہے، یہ مضمون بھی اپنے طرز و انداز کے لحاظ سے اچھا ہے، اس لیے نذر قارئین ہے''۔ (ض)

دنیائے اردو کی مقبول و معروف شخصیت جناب گیان چند جین نے الہ آباد یونی ورسٹی سے داستانوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، پھر کئی یونی ورسٹیوں میں اردو کے ہر دل عزیز استاد رہنے کے بعد اسی یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہوئے، اس کے بعد حیدرآباد سینٹرل یونی ورسٹی سے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ۱۹۹۱ء میں سبک دوش ہوکر لکھنؤ اندرا نگر میں سکونت اختیار کی، ۱۹۹۸ء میں وہ امریکہ تشریف لے گئے اور اب وہیں مستقلاً قیام پذیر ہیں اور اغلباً وہیں کے باشندے بھی ہوگئے ہیں، انہوں نے عروض، تاریخ، تنقید اور تحقیق پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کے لائق اور فائق شاگردوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جو اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں، ان کی گراں قدر خدمات کے اردو والے معترف ہیں، گزشتہ دنوں جب وہ ہندوستان تشریف لائے تھے تو ان کی آمد الہ آباد بھی ہوئی تھی، پروفیسر عبدالحامد کی قیادت میں شعبہ اردو نے ان کو استقبالیہ پیش کیا تھا، جس میں تمام اردو اساتذہ کے علاوہ دنیائے اردو کی کئی متقدر ہستیاں بشمول پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر فضل امام وغیرہ نے ان کو خراج تحسین پیش کیا تھا، ہندی، سنسکرت، انگریزی کے اساتذہ بھی موجود تھے، راقم الحروف

☆ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، ۳۳-۱ اے، کان پور روڈ (مقابل ہائی کورٹ) الہ آباد۔

یہ منظر دیکھ کر مطمئن تھا کہ اردو والوں نے اپنے پیش رو اور بزرگ کو کس طرح آنکھوں پر بٹھایا تھا، کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا اعلا مرتبت شخص، اردو زبان جس کا اوڑھنا بچھونا تھی وہ اردو اور اردو والوں کے لیے ایسے خیالات و جذبات رکھتا ہے جو اس کتاب میں تحریر ہیں، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان کے دکھ کے شجر یعنی اس کاوش کے ثمر اس قدر زہر افشاں ہوں گے کہ جن سے نہ صرف زبان کا مزہ بگڑ جائے گا بلکہ دل و دماغ بھی پراگندہ ہوں گے، دہلی کے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے بھی اس کی اشاعت کا زریں موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کہ اس کے مالکان نے سوچا ہوگا کہ یہ کتاب اپنے اختلافی مشمولات کے سبب بازار میں گرم کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور رقم کثیر گھسیٹنے کا ذریعہ بنے گی، اس کتاب کا سنہ اشاعت ۲۰۰۵ء اور تعداد کتب گیارہ سو ہے لیکن شاید گیارہ لوگ بھی اسے خرید کر نہ پڑھتے اگر پروفیسر شمس الرحمن فاروقی صاحب اتنا مربوط ومبسوط تبصرہ نہ تحریر فرما دیتے جس کے شائع کرنے کے لیے اردو رسائل و جرائد میں ہوڑ لگ گئی اور جو اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے مصداق ٹھہرا ؎

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
شہر میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ہم بھی اس کتاب تک اسی تبصرے کے توسط سے پہنچے، اگر وہ یہ تبصرہ نہ لکھتے تو اس کتاب کی شہرت یا بدنامی محدود المماریوں کی زینت بنی رہتی، فاروقی صاحب ایسے موقعوں پر کھل کر بات کرتے ہیں جب کہ دوسرے بڑے بڑے اہل قلم مصلحت آمیز خاموشی کو حسنِ ادب جانتے ہیں، شری راجندر یادو جی کے اداریہ ہنس کا جواب بھی ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا جس نے شب خون کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے تھے، جین صاحب کی طول العمری اور لمبی خدمات کے مدِنظر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کتاب کا ادبی نوٹس نہ لیا جاتا اور انہیں ارذل العمری اور پاکسن بیماری کی وجہ سے شک کا فائدہ (Benefit ot doubt) دے دیا جاتا اور انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن شاید اس خیال سے کہ اردو والوں کی طرف سے خاموشی اقبال جرم متصور نہ ہو یا اس لیے کہ ادبی رکارڈ کو درست رکھا جائے، فاروقی صاحب نے اپنے منصب و مقام سے اتر کر اس سطح سے جواب دیا جس سطح سے جین صاحب نے گفتگو فرمائی تھی، یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں، انہیں

ہم بڑے لوگوں کے لیے چھوڑتے ہیں۔

اب آیئے ایک عام قاری (layman) کی حیثیت سے بھی اس پر نظر ڈالی جائے، مصنف کے مزاج کا ٹیڑھ پن کتاب کے عنوان سے ہی جھلکتا ہے، اب انتساب پر آیئے، دنیا کی کسی زبان کے کسی مصنف کا انتساب دیکھ لیجیے یہ ہمیشہ احترام، محبت، عقیدت اور تحسین کے الفاظ سے مملو ہوگا، ''معتوب اول''، ''معتوب دوم'' یا ''دشمنان'' جیسے اعلا خطابات سے مزین نہ ہوگا، اس طرح موصوف آیندہ تاریخ ادب میں انتساب کی ایک نئی رسم کے موجد کی حیثیت سے جانے جائیں گے، آپ نے جین صاحب بجا فرمایا ہے کہ بہت سے اردو والے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے ہیں، ان کے متعلق آپ کے انتسابی کلمات بھی اس کے غماز ہیں، ہندی کے متعلق آپ کا یہ ارشاد بھی درست ہے کہ دوسری زبان کے بارے میں لکھتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے، اس میں اس جملے کا اضافہ مناسب ہوگا کہ ''لیکن اپنی زبان کے بارے میں لکھتے وقت ساری بے احتیاطیاں جائز ہیں''، صاحب تصنیف نے ایک بڑی قیمتی بات لکھی ہے کہ مصنف کی وفاداری صرف سچ سے ہونی چاہیے، لیکن کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سچ بیانی کا یہ اعلان ایسا ہی ہے جیسے ہماری عدالتوں میں گواہ حلف لیتا ہے کہ ''میں سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا''، لیکن بیان وہی دیتا ہے جو اسے گواہی کے لیے پیش کرنے والا کہتا ہے۔

عنوان کے حوالے سے اگر موضوع پر نظر ڈالی جائے تو لب لباب یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی آریائی زبان سنسکرت تھی، مختلف علاقوں اور بولیوں کے میل جول سے پراکرت ہوئی، اَپ بھرنش ہوئی، کھڑی بولی ہوئی، ہندوی ہوئی اور پھر اس نے دو رسم الخط یعنی ہندی اور اردو اختیار کیے اور پھر اس سے دو ادب تعمیر ہوئے لیکن اصلاً بھاشا ایک ہے جو دو طرح سے لکھی جاتی ہے، اس بات کی تائید میں ڈاکٹر محمد حسن کا ''پیش لفظ'' اور کمال احمد صدیقی کا ''مقدمہ'' بھی اس کتاب میں شامل ہیں اور بہ قول مصنف قریب قریب یہی آرا، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر ابو محمد سحر، پروفیسر آل احمد سرور، مسعود حسین خاں کی بھی ہیں، اس کتاب کے تبصرے میں پروفیسر شمس الرحمن فاروقی بھی یوں رقم طراز ہیں کہ ''میرا بھی یہی موقف ہے کہ اردو اور جدید کھڑی بولی ہندی صرف سیاسی اور بعض تاریخی وجوہ

سے دو الگ الگ زبانیں قرار پائی ہیں، ورنہ لسانیات کے اصول سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اردو کسی غیر ملک سے نہیں آئی ہے، یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی''، اس بات کو جین صاحب جیسا تجربہ کار اور مشاق مصنف اگر جامعیت سے لکھتا تو ایک مضمون کا دامن کافی تھا نہ کہ تین سو صفحات، اس کتاب کا دو بٹے تین حصہ اس کے موضوع سے میل نہیں کھاتا اور حشو و زوائد کی زد میں آتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں بلکہ ان کے ذہنی سفر کی ڈائری ہے، اردو اور اردو والوں کے خلاف جتنے تعصبات انہوں نے جمع کر رکھے تھے ان کو صفحۂ قرطاس پر اُگل دیا ہے، کبھی انہوں نے مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر نشانہ سادھا ہے اور سیاق و سباق سے ہٹا کر ان کے چند جملوں کو پیش کر کے انہیں ہندوؤں کا دشمن ثابت کیا ہے، کبھی انہوں نے محسنین اردو میر امن، انشاء اللہ خاں انشا، محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خاں کی پگڑیاں اچھالی ہیں تو کہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور اختر حسین رائے پوری کو سازش اور جعل سازی کا مرتکب ٹھہرایا ہے تو کہیں مالک رام کو مکار یا ڈرپوک کہا ہے اور جگن ناتھ آزاد کو تقیہ کرنے والا گردانا ہے تو کہیں مومن، داغ، اصغر اور جگر پر کیچڑ اچھالی ہے، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، عثمانیہ یونی ورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، خلافت تحریک جیسے معتبر اداروں کی بنیادوں پر ضرب لگائی ہے تو فرمان فتح پوری کے ''ہندی اردو تنازعہ'' میں یہ لکھ دینے سے کہ مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو میں گہرا تعلق تھا اس بنیاد پر اس انجمن کو اور بالواسطہ اردو زبان کو تقسیم ہند کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے تو کہیں انجمن پر غداری کا الزام لگایا ہے۔

اردو اور اردو والوں کے بارے میں آپ کے گراں قدر ارشادات کس قدر بلیغ و ارفع ہیں، اس کے کچھ متفرقات ملاحظہ ہوں: ''اردو علاحدگی پسند زبان ہے، اس کے رسم الخط میں بڑی خامیاں ہیں، اس کے شعرا کے ساتھ طوائفوں کے قصے لپٹے ہوئے ہیں، اس میں جنسی جارحیت ہے، اس میں ہندوؤں کی من حیث القوم تذلیل و اہانت ہے، اس کے بڑے بڑے علما کا خیال ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں کا اس کے بنانے میں کوئی ہاتھ نہیں، اردو کے مسلمان ادیب فرقہ پرست ہیں، تنگ نظر ہیں، متعصب ہیں، انہوں نے ہندو تہذیب پر ایسی سیاہی پوت دی ہے کہ ہندو قاری یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا اردو ادب کوئی دوسرا ادب ہے، ہندوستان کے مسلمان دو قومی نظریے کا بھاری گٹھر اپنی کمر پر اٹھائے ہوئے ہیں، اس کی مثنویوں میں مرد کردار مسلمان اور

عورت ہندو ہے'' وغیرہ وغیرہ، موصوف نے اردو اور ہندی اور اردو والوں اور ہندی والوں میں منافرت پھیلانے کا ایسا وافر مواد جمع کر دیا ہے کہ اس کی بنیاد پر ہندوستان کی عدالتوں میں دو فرقوں کے مابین منافرت پھیلانے کے جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چلائے جانے کا صاف کیس بنتا ہے اور اگر کوئی من چلا چاہے تو انہیں ہندوستان کی عدالتوں کے چکر لگوا سکتا ہے، غرضیکہ انہوں نے گڑے مردے اکھاڑ کر اردو والوں کی قبر کھودنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، وہ دستور ہند میں شاید آر ایس ایس والوں کی طرح کامل اعتقاد نہیں رکھتے، آئین ملک کے ہر باشندے کو بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں حقوق دیتا ہے لیکن وہ لکھتے ہیں کہ ''پڑھے لکھے ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو برابر کے اختیار کیوں ہیں'' یا ان کی ایک عزیزہ شرنارتھی پوچھتی ہیں ''یہ لوگ (مسلمان) ملک کی تقسیم چاہتے تھے لیکن اب یہ یہاں کیوں ہیں''۔

ان کی تھیوری ہے کہ اقبال نے نظم تو نہیں نثر میں ہندوؤں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے، انہوں نے اقبال پر نشانہ سادھا ہے مگر بندوق رکھی ہے دوارکا داس شعلہ کے کاندھوں پر، جس کو ان کے مضمون ''دیدہ و شنیدہ'' آج کل دسمبر ۱۹۷۶ء سے اخذ کیا ہے:

''لکھنؤ میں اقبال کے اعزاز میں نشست ہوئی، اس میں پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت اور بے لطفی کا اظہار ہو رہا تھا، اقبال نے ان سے ادب سے پوچھا ''حضور آپ کی موجودگی میں شعر پڑھنا ہے تو بے ادبی لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا غالباً آپ کی توجہ کا مستحق نہ تھا ورنہ از راہ بندہ نوازی کچھ تو ارشاد فرماتے'' بولے'' ہاں صاحب میں نے آپ کا کلام سنا، جو سنا اس پر غور بھی کیا مگر میں سمجھ نہ سکا کہ آپ کا کلام فارسی میں ہے، اردو میں ہے یا کسی اور زبان میں؟ ہم نے تو یہ زبان نہ بولی نہ سنی''۔

علامہ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا، تعجب ہے اس واقعہ کو صرف شعلہ صاحب ہی جانتے تھے اور ۱۹۷۶ء سے پہلے انہیں اس کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا، بہ فرض محال اس واقعہ کو مستند مان لیا جائے تو اس سے پیارے صاحب رشید کی شعر فہمی پر حرف آتا ہے یا اقبال کی شاعرانہ عظمت پر؟ مذکورہ واقعہ جین صاحب نے اقبال کی شاعری کے مفرس ہونے کی ضمن میں نقل کیا ہے اور اس

کے پہلے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر تحریر ہے ؎

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

یہ کہنا تو گستاخی ہوگی کہ بال جبرئیل کی پہلی غزل کے اس مطلع کو پیارے صاحب یا جین صاحب نے کہاں تک سمجھا ہے مگر جین صاحب شاعر بھی ہیں، ذرا اس شعر کو آسان زبان میں کہہ کر دکھا دیں، اس میں اقبال نے جو مضمون باندھا ہے، اس کے لیے کیا اس وقت کی شاعری کی مروجہ زبان اس کی ادائیگی کی متحمل تھی؟ اس غزل کے اور دو شعر دیکھیے ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے ہی توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ذرا ملاحظہ کیجیے اقبال کس مقام سے گفتگو کر رہا ہے، وہ ملٹن کا ہم سر یا اس سے دو بالشت اونچا نظر آ رہا ہے کہ نہیں، اب ہم اقبال کی شاعری کی یہ رفعت دیکھیں یا یہ دیکھیں کہ پیارے صاحب اور جین صاحب اس کے مطلب کو کہاں تک پہنچ رہے ہیں؟

چلیے اب ذرا اس کتاب کے معیار تحقیق پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے، اردو کا عام قاری انہیں مستند محقق گردانتا ہے، قدیم کلام کو پرکھنے کے لیے انہوں نے امرت رائے اور ان کے بدرقہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا طریقہ تحقیق صحیح مانتے ہوئے اپنے خیال سے رجوع کر لیا ہے، یہ ظرف کی بات اور بڑے محقق کی نشانی ہے مگر انہوں نے اس کتاب میں جو معیار قائم کیا ہے ذرا اس کو ملاحظہ کریں کہ ''میری بھابھی نے یہ کہا''، ''میرے شاگرد ریسرچ اسکالر نے ووٹ ڈالنے کے بارے میں یہ کہا''، ''فلاں صاحب نے مجھے پاکستان سے فون کیا تو یہ کہا''، ''فلاں صاحب پاکستان گھوم کر لوٹے تو یہ بتایا''، ''فلاں صاحب نے ایک ملاقات میں مجھ سے یہ یہ کہا'' وغیرہ وغیرہ سنی سنائی باتوں پر کلیدی نتائج اور حتمی آرا قائم کرنا تحقیق کا کون سا فن ہے، یہ فن تو خود ان کی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں درج نہیں، اب جین صاحب ان کے رفقا اور شاگرد خود فیصلہ کریں کہ

کیا ایسی تحریروں سے ان کی حیثیت بہ طور محقق مجروح نہیں ہوتی؟

موصوف نے اس کتاب میں اردو تاریخ کے کئی مصدقہ حقائق کو جھٹلانے کی بھی ناکام کوشش کی ہے، مثلاً اس حقیقت کو وہ من گھڑت کہتے ہیں کہ ہندی ملک کی قومی زبان ڈاکٹر راجندر پرساد جی کے کاسٹنگ ووٹ سے بنائی گئی تھی، اپریل ۱۹۳۶ء میں ناگپور میں ہندی ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں مہاتما گاندھی نے ہندی کی موافقت کی تھی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا تھا، ان کے اس بیان کو وہ جعل سازی سے تعبیر کرتے ہیں، ان دونوں باتوں کی تائید میں جو شواہد وہ پیش کرتے ہیں وہ نہایت لچر اور غیر معتبر ہیں، یہ موضوع الگ سے مدلل تحریر کا متقاضی ہے جس کا نقشہ راقم الحروف کے ذہن میں ہے لیکن یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ واقعہ گاندھی جی کی حیات میں متعدد رسائل و جرائد میں مختلف انداز سے شائع ہوا لیکن مہاتما جی نے تحریری طور پر کبھی کی تردید نہیں کی جب کہ کئی پرچے ان کی نگرانی میں نکلتے تھے، اس سلسلے میں ملاحظہ کیجیے مدلل گفتگو جو سید ابوالقاسم نے کی ہے اور جو "ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد" کے رسالے "ہندوستانی" شمارہ ۱۹۳۷ء میں صفحہ ۲۰۳ تا ۲۹۴ زیر عنوان "مہاتما گاندھی سے بات چیت، ٹھیٹ اردو میں" شائع ہوئی ہے اور اس وقت اس رسالے کے ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر عبدالستار صدیقی، مسعود حسین رضوی ادیب، منشی دیا نرائن نگم اور پروفیسر ضامن علی اڈیٹر تھے، یہ تارا چند جی وہی ہیں جن کا کتابچہ "ہندوستانی کے مسائل" یعنی The Problems of Hindustani ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا اور اردو کے ارتقا پر ان کا مضمون، زیر گفتگو کتاب پر بھاری ہے۔ جین صاحب کا مضمون "مہاتما گاندھی اور اردو رسم الخط" جو "شب خون" اپریل ۱۹۹۷ء شمارہ نمبر ۲۰۵ میں شائع ہوا تھا اور جو "شب خون" کے آخری شمارے (حصہ دوم) کے صفحہ ۱۶۵۴ میں بھی شامل انتخاب ہے اور جس کا نفس مضمون اس کتاب کی زینت ہے، اس مضمون میں جین صاحب نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو "بدتہذیبی" اور "بدتمیزی" کے خطابات سے نواز کر کس تہذیبی وراثت کا ثبوت دیا ہے، آج ان کی علمی پہچان اردو کے اسکالر کی حیثیت سے ہے اور اگر وہ اسی شجر کی بیخ کنی فرمائیں گے تو ان کی شناخت کا کیا ہوگا؟

اردو اور اردو والوں کے متعلق تمام شناعت وقباحت اور قذف و بہتان کے علی الرغم اس کتاب کا ایک پہلو حوصلہ افزا بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص اپنی ہشتاد سالگی، پارکنسن بیماری کے باوجود اردو کے مراکز سے بہت دور، سات سمندر پار بیٹھ کر مواد جمع کرتا ہے، کتاب تحریر کرتا ہے، کسی کو اپنی رائے سے اتفاق کرنے کا اصرار نہیں کرتا، شاگردوں سے صفائی بھی پیش کرتا ہے، یہ اس دشت کے رہرووں کے لیے بڑی ہمت افزا بات ہے، دوسرا پہلو اطمینان کا، ان کے مندرجہ ذیل ارشادات میں:

"یہ ماننے میں کہ کھڑی بولی پچھڑی اور جامد زبان تھی، بیرونی مسلمانوں کی سرپرستی نے اس کے نوک و پلک سنوارنے کے بعد اردو کے پیرہنِ دل کش کی شکل دی، ادبی محاورے میں یہ چہچہاتی ہوئی ظاہر ہوئی"۔

یا "ختم کلام" کے باب میں فرماتے ہیں:

"مجھے ہندی سے اردو زبان بہتر لگتی ہے"۔

"مجھے اردو زبان اس کے اپنے رسم الخط اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ پسند ہے، میں اسے اردو خط کے علاوہ کسی اور لپی میں برداشت نہیں کروں گا، جو اہلِ ہندی چاہتے کہ اگر اردو دیوناگری لپی میں لکھی جائے اور اس کا شبد بھنڈار دیسی ہوجائے تو وہ اردو کہاں رہے گی، اگر یہ پسند ہے تو ہندی کیا بری ہے، بہر حال میں اپنی زبان کیوں چھوڑوں ...... زبانیں ملکوں اور قوموں کا سرمایہ ہوتی ہیں، اس سرمائے کی حفاظت سب کا فرض ہے"۔

یہ اختتام اور پھر سنسس میں زبان کے خانہ میں ان کی اہلیہ کا ہندی اور ان کا اردو زبان کو مادری زبان کوشش کر کے لکھوانا، یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ اردو زبان سے ان کا خون کا رشتہ ہے، اسے کوئی کیسے منقطع کرے گا؟

اس کتاب میں فدائیان اردو کے لیے ایک لمحہ فکر یہ بھی ہے کہ تمام عمر اردو کی خدمت میں کھپانے کے باوجود آخر میں جین صاحب کو یہ تاثر کیسے ملا کہ اردو والے ہندو ادیبوں کے تئیں متعصبانہ یا معاندانہ رویہ رکھتے ہیں یا ان کے لیے کچھ بھی کہنے یا لکھنے کو روا سمجھتے ہیں، اگر یہ باتیں درست ہیں تو ان کا تدارک ہونا چاہیے اور اگر محض تاثر ہے تو بھی قانون کا ایک مقولہ ہے کہ

انصاف صرف کرنا نہیں چاہیے بلکہ ہوتے ہوئے دکھائی بھی دینا چاہیے (justice should also be seen to be done) لہٰذا ایسے احتمال کو بھی دور کرنا ہوگا ورنہ غیر مسلم اسکالر اس طرف یہ سوچ کرنہ آئیں گے کہ جب جین صاحب کے عمر بھر خاک چھاننے کا یہ صلہ ملا ہے تو اس دشت کی صحرا نوردی سے ہمیں کیا ملے گا؟ اس سے کس کا نقصان ہوگا؟ صرف اور صرف اردو کا، زبان کسی کی جاگیر نہیں ہوتی ہے جو اس کی خدمت کرتا ہے جو اسے برتتا ہے بس یہ اسی کی ہوتی ہے، کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سرکاری طور پر ہندوستان میں جو مواقع غیر مسلم اردو والوں کو ملتے ہیں وہ مواقع اسی صلاحیت کے مسلم اردو والے کو نہیں ملتے لیکن ان سب سے قطع نظر اردو والوں کو جین صاحب کے اس درد کو سمجھنا اور محسوس کرنا چاہیے اور ایسی روش سے احتراز کرنا چاہیے کہ زبان و ادب کا آیندہ مورخ صاحب قلم کے مذہب کی بنیاد پر نہیں اس کی خدمت کا تجزیہ متعین میزانِ ادب پر کرے گا، اس صحرا کو چمن زار بنانے میں سب کا ہاتھ ہے اور یہ زبان سب کی ہے مگر ایسا بھی نہ ہو کہ ؎

اہلِ دانش نے ہنر خوب کیا ہے ایجاد
بے وفا خود ہیں مگر دادِ وفا چاہتے ہیں
وہ کہ جس شاخ پہ بیٹھے ہیں، وہی کاٹتے ہیں
اور اسی شاخ پہ بیٹھے بھی رہا چاہتے ہیں

☆☆☆☆☆

اخبار علمیہ

شاہ سعود یونی ورسٹی کے تحت چلنے والے کمپیوٹر انفارمیشن کالج میں دو طالب علم عبداللہ العسیری اور عبدالرحمٰن الہزیلی نام کے ہیں، انہوں نے انگوٹھے کے ذریعہ پہچان کے روایتی طریقہ کو ذہن میں رکھ کر Finger Print Authentication System کے نام سے ایک کمپیوٹر نظام ترتیب دیا ہے، دفاتر کے جو ملازمین تاخیر سے جا کر حاضری بنا دیتے اور دستخط کر کے وقت سے پہلے دفتر سے غائب ہوجاتے یا اپنے رفقائے کار کے ذریعہ اپنی حاضری بنوا دیتے ہیں اس نظام میں اس کی گنجایش نہیں ہوگی، اس کا عربی نام طالب علموں نے "نظام التعرف علی البصمة" رکھا ہے، جس کو ان کے استاد پروفیسر صلاح محمد رحال کے اچھی طرح ملاحظہ کر لینے کے بعد ملک کی مختلف نمایشوں، شوروموں اور کانفرنسوں میں متعارف بھی کرایا جاچکا ہے، طالب علموں کا خیال ہے کہ اس کے رواج کے بعد غلط کاروں اور مجرموں کی شناخت آسان ہوجائے گی کیوں کہ اس کے ذریعہ متعلق شخص کے نشان ہائے انگشت کمپیوٹر میں اس طرح ثبت ہوجائیں گے کہ ان کو مٹانا ناممکن ہوجائے گا، رپورٹ میں اس کے یہ فوائد بھی تحریر ہیں کہ اس نظام کو عنقریب ویزا کی کارروائیوں، ملک میں واردین وصادرین اور ان کے دخول وخروج کی دستاویزات، حج وغیرہ کے کاغذات اور مالیات کے شعبوں اور بینکوں میں لین دین کے لیے بھی بہ خوبی استعمال کیا جاسکے گا، ٹیکنیکل افراد اور تجار نے اسے دنیا بھر میں رواج دینے کا مشورہ دیا ہے، شاہ سعود یونی ورسٹی کے اساتذہ نے اس نظام کو کمپیوٹر سائنس کی دنیا میں ایک اضافہ قرار دیا ہے، یہ خبر "الاقتصادیہ" میں شائع ہوئی ہے۔

جدہ یونی ورسٹی انجینئرنگ کالج میں ایک ایسا سنٹر قائم ہوا ہے جس کا مقصد انجینئرنگ کورس کی جملہ کتابوں، اس کی ٹیکنکل اصطلاحات وغیرہ کو عربی زبان میں منتقل کرنا ہے، سنٹر نے چند جامع پروگرام مرتب کیے ہیں، عربی میں منتقل کرنے کے لیے ۱۵۵ انجینئرنگ سے متعلق کتابوں کو منتخب کیا گیا ہے، توقع ہے کہ اس اہم علمی و تعلیمی خدمت سے سعودی عرب کی علمی و تعلیمی فضاؤں میں خالص اسلامی و مذہبی تعلیم کے ساتھ سائنس و ٹکنالوجی سے دل چسپی بڑھ جائے گی، جو یقیناً نیک فال ہے، یہ اطلاع سعودی ذرائع ابلاغ نے دی ہے۔

عربی روزنامہ "الندوہ" کی اطلاع ہے کہ کویت میں قائم "افریقی اسلامی سوسائٹی" نے

افریقہ میں تعلیمی، طبی، دینی اور معاشرتی میدانوں میں حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں، ۱۹۸۲ء سے اب تک کی اس کی خدمات کی تفصیل یہ ہے، ۵۱۰ مسجدیں، ۵۴۰ قرآنی مکاتب، ۹۰ عربی زبان وادب، دعوت ارشاد کے ادارے، ۹۰ ٹیکنکل تعلیم کے ادارے، ساڑھے چار ہزار یتیموں کی تعلیم وکفالت کے لیے ۱۲ سو مبلغین کا تقرر، ۵۵ ہزار مسلم طلبا کی تعلیمی فیس کی ادائیگی، ۲۰ ہزار ٹن غذائی اشیا اور دواؤں کی فراہمی، ڈھائی کروڑ قرآن مجید کے نسخوں کی تقسیم، اسلامی موضوعات پر مشتمل ۳۰ لاکھ کتابوں کی اشاعت، اس کے علاوہ انہوں نے ایک اسلامی ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیا ہے جو افریقہ کی سولہ ریاستوں کے لیے آٹھ زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے، نامساعد حالات اور عیسائی مشنریوں کی رخنہ اندازیوں کے باوجود ان خدمات کو انجام دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں مگر اس کے بالمقابل افریقہ میں عیسائیت کے فروغ کے لیے امریکہ میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اس سے بڑھ کر تعجب خیز ہیں، انہوں نے ۱۳۹ ملین ڈالر جمع کر کے ۲۹ لاکھ ۹۸ ہزار ایک سو عیسائی مبلغین کا تقرر کیا، ۶۴ ہزار ۴ سو تبلیغی کتابوں کی اشاعت کی، ۱۱ کروڑ ۲۵ لاکھ ۶۴ ہزار ۴ سو انجیل کے نسخے تقسیم کیے، ۲۰ ہزار ۴ سو دعوتی رسالے شائع کیے، مختلف علاقوں میں ۱۶ سو ۲۰ ریڈیو اسٹیشن قائم کیے، یہ رپورٹ امریکی تحقیقاتی مجلّہ برائے فروغ عیسائیت جلد ۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی ہے، جہاں افریقی اسلامی سوسائٹی، افریقی مسلمانوں کے وجود وبقا کے لیے سرگرم عمل ہے، وہاں عیسائی مشنریاں ان کی شناخت، تشخص اور وجود کو مٹانے اور اسلام اور عالم اسلام سے ان کا رابطہ ختم کرنے کے درپے ہیں۔

ہبرو یونی ورسٹی کے سائنس دانوں کے بیان کے مطابق اسرائیل میں یروشلم اور تل ابیب کے بیچ میں اے ایلان نامی غار ہے، جس کی کھدائی کے دوران اب تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ حیوان غیر ناطق کی آٹھ نئی نسلیں پائی گئی ہیں، ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ غار کی اپنی خصوصیت ہے اور یہ مدت مدید سے انسانوں کی دست رس سے باہر رہا، اس کے اوپر دودھیا مٹی یا چونا کی موٹی پرت ہے، اسی سبب سے یہاں پانی کا ملنا ناممکن ہے، چونے کے پتھروں والا یہ غار ۲،۵ کلومیٹر وسیع ہے، جانوروں کی ان آٹھ نئی نسلوں میں ۴ سمندری اور تازہ پانی والے اور ۴ خشکی پر رہنے والے جانداروں جیسی ہیں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان دریافت شدہ نسلوں کی ساخت وہیئت اور طرز معاشرت دوسرے جانوروں سے قدرے مختلف ہے، ان کو اسرائیل اور باہر کی دوسری تجربہ گاہوں

میں تحقیق وتفتیش کے لیے بھیج دیا گیا ہے، قیاس ہے کہ یہ نئی نسلیں کروڑوں برس قدیم ہیں، غار میں بیکٹیریاز بھی ملے ہیں جو ممکن ہے اس ماحولیاتی نظام میں خوراک اور غذا کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہوں۔

یونان میں قرآنی تعلیمات کے فروغ واشاعت کے لیے یونانی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے، اس کا سہرا ایتھنس کی ایک تنظیم "الرابطہ الیونانیہ العربیہ" کے سر ہے، اس ترجمہ میں دس سال کی مدت صرف ہوئی ہے نیز اسے یونان اور جامعہ ازہر کے مستند ومعتبر علما کی نظر سے بھی گزارا جاچکا ہے، اسے یونانی عوام میں مفت تقسیم کیا جائے گا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ترجمہ کو قرآن کریم کے ان ترجموں سے مکمل طور پر علاحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں قرآن کے اصل معانی ومفاہیم کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

میڈرڈ یونی ورسٹی کے کتب خانہ میں چودہ ملین کتابیں اور مخطوطات ہیں، کتب خانہ کے ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ ان میں سے دس ہزار اسلامی مخطوطات کتب خانہ اسکندریہ کو ہدیہ کردی جائیں گی، یہ کتابیں معروف علما وحکمائے اسلام اور بالخصوص اسلامی فتوحات سے متعلق ہیں اور ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھیں۔

گورنمنٹ انجینئرنگ وٹیکنکل کالج کلکتہ کے دو طالب علموں نے اپنی ایک ریسرچ میں کہا ہے کہ انہوں نے روایتی چمڑے کا جس سے جوتے اور چپل وغیرہ بنائے جاتے تھے متبادل تلاش کرلیا ہے، انہوں نے مچھلی کے چمڑے پر تحقیق کی ہے اور دعوا کیا ہے کہ اس سے کوئی بھی چیز بنائی جاسکتی ہے، خاص بات یہ ہے کہ مچھلی کا چمڑا ماحول دوست ہوتا ہے اور اس سے کوئی چیز تیار کرنے میں خطرناک آلات کی ضرورت نہیں پڑے گی، ان کے بیان کے مطابق اس سے جوتے اور جھولے سمیت متعدد اشیا بنائی بھی گئی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بھوتکی، تیلیا اور بووال وغیرہ مچھلیوں کے چمڑے انتہائی کارآمد ومفید ہیں، ان سے تیار شدہ چمڑے بے حد چکنے اور گائے، بھینس، بکری اور بھیڑ سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں اور مچھلی کا چمڑا دوسرے جانوروں کے چمڑوں سے ارزاں بھی ہوتا ہے، انہوں نے اپنی ریسرچ کے نتائج متعلقہ وزارت کو بھی بھیجا ہے تاکہ حکومت اس جانب متوجہ ہو۔

ک، ص اصلاحی

☆☆☆☆☆☆

وفیات

آہ! مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی کا انتقال ۱۱/ جون کو ہوا مگر کچھ پتا نہیں چلا، ممبئی کے اخبار یہاں نہیں آتے، وہاں سے آنے والوں نے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، ان کے عزیزوں اور صاحب زادوں کو اتنے جاں کاہ حادثے میں ان کے اس دور افتادہ قدرداں اور نیاز مند کا خیال نہیں آیا، جولائی کا ترجمان اصلاحی ۱۱/ جولائی کو آ گیا تھا مگر اسی روز میری چھوٹی بہن نسیمہ اللہ کو بیماری ہوگئی تھی، کئی روز بعد گھر سے آنے پر اسے کھولا تو سرورق پر حکیم صاحب کی تصویر کے نیچے یہ مصرعہ درج تھا ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

دل کا عجیب حال ہوگیا، بہن کا غم تازہ ہی تھا کہ اب اس مسیحا نفس کی بات بھی گئی۔

موت برحق ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں، حکیم صاحب تو عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے مگر ان کے جیسے کرم فرما اور اپنے سے اس قدر ٹوٹ کر ملنے اور چاہنے والے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا، ان کی یاد بھلائے نہیں بھولتی ؎

آئی جو یاد ان کی تو آتی چلی گئی ہر نقش ماسوا دل سے مٹاتی چلی گئی

وہ ضلع جون پور کے مشہور مردم خیز قصبہ صبرحد میں ۱۵/ جون ۱۹۱۵ء کو ایک متوسط زمیں دار گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ممبئی میں رہتے تھے، اردو اور فارسی کی تعلیم دادا کے زیر نگرانی گھر پر ہوئی، اعلا تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں حاصل کی، جہاں مولانا شبلی متکلم ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ سے درس لیا، جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی ان کے ہم سبق تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد علی گڑھ کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں والد کے پاس ممبئی تشریف لے گئے اور پھر وہیں کے ہوگئے، محمد علی روڈ پر فینسی محل میں مطب شروع کیا اور اس کا نام اصلاحی دواخانہ رکھا، اب ان کے چھوٹے صاحب زادے حکیم محمد طارق اصلاحی

وہاں بیٹھتے ہیں۔

ممبئی جیسے ہنگامہ خیز اور بڑے شہر میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر، طبیب، دواخانے اور اسپتال تھے، ان کی موجودگی میں بہت جلد شہرت و مقبولیت اور غیر معمولی کامیابی حاصل کر لینے اور اپنی حذاقت و مہارت کا سکہ جما لینے میں حکیم صاحب کے ملکۂ خداداد، ذہانت و قابلیت کے علاوہ ان کی محنت، جاں کاہی، باقاعدگی، اصول پسندی، استقلال، میانہ روی، یک سوئی، پیشے سے خلوص، مریضوں سے ہمدردی، فیض رسانی اور خدمت خلق کے جذبے کو بھی بڑا دخل تھا، اگر ان کا مقصد حصول زر ہوتا تو جدید طریقہ علاج یا کسی اور پیشے کو اختیار کرتے مگر انہوں نے مخالف ہوا میں بھی طب یونانی کا چراغ روشن رکھا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

حکیم صاحب بڑے عزم و حوصلے کے آدمی تھے، بڑھاپے میں بھی نہایت چاق و چوبند رہتے، کبھی ہمت نہ ہارتے، اپنی دھن میں لگے رہتے، اپنے اصل پیشے سے کبھی بے پروائی نہ برتتے، دوسرے کام ان کی نظر میں ضمنی اور ثانوی تھے، اصل توجہ طبابت پر ہوتی اور اس میں نئی جدت و اختراع کرتے رہتے، ان میں جوانوں سے زیادہ قوت عمل اور جوش تھا، انہوں نے جب مجھے بے تکلف بنا لیا تو میں کہا کرتا تھا "جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب"۔

حکیم صاحب کا دائرہ فیض ممبئی تک محدود نہ تھا، ان کا اصل مرکز تو ممبئی میں فینسی محل کا اصلاحی دواخانہ تھا مگر اس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی تھیں، نہرو نگر کرلا ایسٹ میں اصلاحی ڈرگ کے نام سے دواؤں کو جدید طرز پر تیار کرنے کے لیے ایک فیکٹری قائم کی تھی جس میں ہر قسم کے پیڑ پودے اور جڑی بوٹیاں مہیا کی گئی تھیں، دوارکا پوری کرلا ویسٹ میں اصلاحی یونانی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کھولا جس میں جدید طرز کے آلات اور مشینوں سے دوائیں تیار ہوتی تھیں، دہلی اور حیدرآباد میں بھی اصلاحی دواخانے کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں، ان کے کاموں کے پھیلاؤ اور وسعت کی بنا پر ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو حکیم عبدالحمید ثانی ہیں۔

وہ کھانے پینے اور رہنے سہنے میں بڑے محتاط تھے، ان کی خوراک بہت کم اور سادہ تھی، مجھے ان کے یہاں کئی بار کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے کا اتفاق ہوا، جس میں اور بھی لوگ مدعو ہوتے تھے، حکیم صاحب ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھتے مگر خود کھانے کے بجائے دوسروں کی پلیٹ میں چیزیں

ڈالتے رہتے ، ایک دفعہ میں نے کہا آپ تو حکیم عبدالحمید ثانی معلوم ہوتے ، میں ایک مرتبہ ہمدرد نگر میں اوصاف علی صاحب کے ساتھ قیام پذیر تھا، حکیم عبدالحمید صاحب نے لال کنواں کے پاس اپنے گھر کھانے کی دعوت کی ، وہاں آٹھ دس آدمی اور رہے ہوں گے، حکیم عبدالحمید صاحب سب کے ساتھ بیٹھے مگر ایک لقمہ بھی نہیں لیا، دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ رات میں کھانا نہیں کھاتے اور دن میں بھی دہی اور تھوڑا سا جوس ان کی غذا تھی ، دارالمصنفین آتے تو اس کا انتظام کیا جاتا۔

حکیم محمد مختار صاحب صبح سویرے اٹھتے ،ضروری کاموں سے فارغ ہوکر لوکل ٹرین سے دواخانے جاتے اور پھر عشاء کے وقت لوکل ٹرین ہی سے واپس آتے ، آخر میں یہ معمول بدل گیا تھا ، غالباً دو بجے دن میں واپس آجاتے ، دوسرے وقت ان کے صاحب زادے مطب میں رہتے ،ایک دفعہ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اور کشادگی دی ہے ،انہیں اپنی گاڑی سے مطب آنا جانا چاہیے ، وہ خواہ مخواہ زحمت اٹھا کر ٹرین سے آتے جاتے ہیں ، انہوں نے کہا یہ صحیح ہے کہ اپنی ذات پر زیادہ خرچ کرنا حکیم صاحب کے مزاج کے خلاف ہے مگر ممبئی میں لوکل ٹرینوں سے آنے جانے میں بڑا وقت بچتا ہے ، اپنی گاڑی میں اس ہنگامہ خیز اور بھیڑ بھاڑ کے شہر میں بڑا وقت لگ جاتا ہے ، بعد میں اس کا تجربہ خود مجھے بھی ہوا ، ایک دفعہ میں مولانا مستقیم احسن اعظمی کے یہاں مدن پورہ میں تھا وہاں سے مجھے ، انہیں اور ان کے گھر والوں کو حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں آنا تھا ، مولانا مستقیم صاحب نے گاڑی کر لی مگر گھنٹوں تاخیر سے پہنچے۔

حکیم محمد مختار اصلاحی کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی تنہا ان کی طبی مہارت و حذاقت ہی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کے علم و وقار ، شرافت و شائستگی ، عالی ظرفی و وسیع القلبی ، رکھ رکھاؤ ، وضع داری ، حسن اخلاق اور باہمہ و بے ہمہ رہنے کی وجہ سے بھی وہ ممبئی کے ہر طبقے میں معزز و محترم سمجھے جاتے تھے ، جس مجلس میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھا دیتے ، ان کی رائے کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا تھا ، وہ اصلاً تو صرف اپنے پیشے اور فن سے سروکار رکھتے تھے تاہم معاشرتی اور قومی انجمنوں اور علمی و ادبی اداروں سے بھی ان کی وابستگی رہتی تھی مگر ان میں ایک حد تک اور بڑے اعتدال ہی سے حصہ لیتے تھے ، مہاراشٹر کی جمعیۃ علما سے بھی ان کا تعلق تھا ، طبیہ کالج ، وقف بورڈ

اور حج کی کمیٹیوں کے ممبر تھے ، جن اداروں اور انجمنوں سے ان کا عملی تعلق نہیں ہوتا تھا ان کی بھی مالی مدد کرتے تھے ، حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا تھا مگر ان کی دولت ان کے آرام و تعیش کے بجائے ضرورت مندوں پر صرف ہوتی تھی ، اپنے آبائی وطن صبر حد کے جامعہ فاروقیہ ، سرسید انٹر کالج اور گرلس ہائی اسکول کی برابر مدد کرتے رہتے تھے ، ہارون صاحب پرنسپل صابو صدیق نے مولانا عبدالسلام ندوی پر کامیاب سمینار کرایا تو ان سے کہا کہ اقبال سہیل صاحب پر بھی آپ سمینار کرائیں ، اس کا نصف خرچ میں دوں گا ، وہ جامعہ فاروقیہ صبر حد کے سالانہ جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لیے ممبئی سے تشریف لاتے اور ان کے مصارف کے بہت کچھ وہی متکفل ہوتے تھے ، مدرسۃ الاصلاح سے بھی ان کا بڑا تعلق تھا ، اس کی مجلس عام کے سالانہ جلسوں میں بھی تشریف لاتے ، ان ہی کی کوشش اور دلچسپی سے " حکیم محمد مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج " قائم ہوا۔

انہوں نے بڑی مشغول زندگی گزاری اور یہی ان کی کامیابی اور ترقی کا اصل راز ہے ، مطب کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت میں بھی ان کے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ و تحقیق کا شوق کم نہ ہوا تحریر و تصنیف کا شغل جاری رہتا ، ان کی ادارت میں ماہ نامہ " تندرستی " اور پندرہ روزہ " مسیحا " عرصے تک شائع ہوتے رہے جن سے طب اور اردو زبان دونوں کی خدمت ہوئی ، " اطبا اور ان کی مسیحائی " ان کی بڑی مفید اور پراز معلومات کتاب ہے ، دوسری کتاب " بری عادتیں - نقصانات اور تدارک " اخلاقی اور طبی حیثیت سے بڑی مفید اور قابل قدر ہے۔

مرحوم حکیم صاحب کی زندگی بڑی سادہ مگر بہت مرتب تھی ، وہ بڑے صفائی پسند تھے ، ان کی کوئی چیز منتشر اور بے سلیقہ نہیں ہوتی تھی ، کمرہ آرائش اور زیبائش کے سامان سے خالی ہوتا تھا مگر میز پر کاغذ ، کتابیں ، پنسل اور قلم اور الماریوں میں کتابیں بڑے مرتب طور سے سلیقے سے رکھی ہوتی تھیں ، خط کتابت اور دوسری ضروری چیزوں کا ریکارڈ رکھتے تھے ، لوگوں کے خطوط کی الگ الگ فائلیں بنائی تھیں۔

ممبئی کے ہر طبقے میں وہ معروف و متعارف تھے ، ملک کے مشاہیر علما و اطبا سے ان کے تعلقات تھے ، ممبئی کے لوگوں میں مولانا مختار احمد ندوی کے اس لحاظ سے بڑے مداح تھے کہ وہ برابر فلاح و بہبود کے کام کرتے رہتے ہیں ، ملک کے ہر علاقے میں مساجد تعمیر کرائیں ، الدار السلفیہ قائم کیا ، بہت سی اہم کتابیں شائع کیں " البلاغ " کے نام سے اچھا رسالہ نکالا ، مئو اور مالیگاؤں میں طلبہ و طالبات کے کالج قائم کیے اور ان کی شان دار عمارتیں بنوائیں ، مالیگاؤں میں سائرا سپتال اور

طبیہ کالج کھولے جس میں حکیم محمد مختار اصلاحی کا بھی بڑا تعاون تھا، کالج کے ابتدائی دور میں اپنے بڑے صاحب زادے حکیم محمد فیاض کو اس کا نظم و نسق درست کرنے کے لیے پرنسپل بنایا، ان کے دل میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بڑی عزت تھی، وہ جب ممبئی آتے تو حکیم صاحب ان سے ملنے جاتے اور مولانا کو بھی اپنے یہاں مدعو کرتے، مولانا بھی ان کا بڑا خیال کرتے، ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم کا پچاسی سالہ جشن منایا گیا تو اس میں حکیم صاحب کو بھی مدعو کیا اور وہ تشریف بھی لائے، مولانا امین احسن اصلاحی کے علم و فضل اور تقریر و تحریر کے بہت معترف تھے، ان سے خط کتابت بھی رہتی تھی، علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی سے غیر معمولی عقیدت تھی، ایک بار میں نے ان سے عرض کیا کہ دارالمصنفین کی جو کتابیں عرصے سے نہیں چھپ رہی ہیں ہم لوگوں نے ان کی دوبارہ اشاعت کا پروگرام بنایا ہے، اس نئے بوجھ کا متحمل دارالمصنفین نہیں ہوسکتا، انہوں نے کہا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا، مولانا شبلی کی کوئی کتاب ہو تو اسے میرے خرچ سے چھپوا دو، عرض کیا سیرۃ النبی حصہ اول کی طباعت کے لیے علامہ کی پوتی صاحبہ رقم دے چکی ہیں، انہوں نے فرمایا حصہ دوم کے لیے مجھ سے ایک لاکھ روپے لے لیجیے، مولانا حمید الدین صاحب کے متعلق فرمایا کہ ان سے تعلق جوڑنے کے لیے اپنی لڑکی کا رشتہ ان کے پوتے پروفیسر عبید اللہ فراہی سے کیا، ان دونوں حضرات کی یادگار مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنفین سے ان کو عشق تھا، مدرسۃ الاصلاح کو ان کی خاص دین حکیم مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج ہے، اس کی جو چھوٹی کمیٹی حکیم صاحب نے بنائی تھی اس میں فرط تعلق و اعتماد کی بنا پر میرا نام بھی رکھا تھا۔

دارالمصنفین سے بھی ان کا تعلق بڑا گہرا تھا، شاہ معین الدین احمد صاحب جامعہ فاروقیہ صبر حد کے جلسوں کی مستقل صدارت کرتے تھے پھر صباح الدین صاحب اور اس خاکسار کو بھی یہ عزت بخشی گئی، میں نے انہیں پہلی بار طالب علمی میں مدرسۃ الاصلاح کی مجلس عام کے سالانہ جلسوں میں دیکھا، پھر شاہ صاحب کی معیت میں جامعہ فاروقیہ صبر حد کے سالانہ جلسوں میں ملا، اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے آخر میں میرے والدین حج بیت اللہ کے لیے جا رہے تھے تو میں انہیں چھوڑنے ممبئی گیا، اسی سلسلے میں ان کے مطب سے گزرا تو ان سے ملنے گیا، اپنا تعارف کرایا، انہوں نے آنے کا مقصد دریافت کیا، بتانے پر فرمایا کہ میں تو بندرگاہ پر نہیں جاؤں گا لیکن حکیم نور الدین اصلاحی جن کو تم جانتے ہو تمہاری مدد کریں گے، میں ان سے کہہ دوں گا۔

اب یہ خیال نہیں آتا کہ ان سے اتنے زیادہ تعلقات کب ہوئے کہ میں ممبئی جاؤں یا وہ ادہر آئیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے ملے بغیر چین نہیں ملتا تھا، میں نے دارالمصنفین کی طرف ان کی

غیر معمولی توجہ دیکھ کر اس کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے ان کا نام تجویز کیا تو ارکان نے بہ اتفاق منظور کر لیا مگر پہلے تو عدیم الفرصتی پھر ضعف کی وجہ سے کسی جلسے میں شریک نہیں ہوسکے، ان کو دارالمصنفین کی مالی حالت کے استحکام کی بڑی فکر رہتی تھی، اس کے لیے اکثر اپنی تجویزیں مجھے بھیجتے، ممبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی پر جب سمینار ہونا طے پایا تو انہوں نے مجھے لکھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم لوگوں کا اجتماع یہاں کروں، ہم لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی البتہ انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا اعظم گڈہ آنے کے لیے تیار ہوگئے، حکیم صاحب کو پتا چلا تو وہ بھی آنے کے لیے آمادہ ہوگئے، سب نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی لے لیے مگر رضوان فاروقی صاحب کی شدید علالت کی وجہ سے یہ پروگرام منسوخ ہوگیا۔

چند برس سے حکیم صاحب خانہ نشین ہوگئے تھے، مطب جانا موقوف ہوگیا تھا، ان کا فلیٹ جامع مسجد کرلا کے سامنے "نور جہاں" بلڈنگ کی چوتھی منزل پر تھا، اس سے نیچے نہیں اترتے تھے، یہ کیفیت کئی برس سے تھی تاہم ان کی موجودگی ہی ان کے عزیزوں اور فرزندوں کے لیے بڑا سہارا تھی، مدرسۃ الاصلاح اور حکیم محمد مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج کے کارکنوں اور اس ناچیز کے لیے باعث تقویت تھی، افسوس اب یہ سہارا نہیں رہا، اللہ تعالیٰ ان کو اعلاءِ علیین میں جگہ دے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے قائم کردہ اداروں کا فیض باقی رکھے اور انہیں فروغ بخشے، آمین۔

پروفیسر خورشید الاسلام

پروفیسر خورشید الاسلام ۱۸؍ جون کو علی گڑہ کی خاک کا پیوند ہوگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وہ جولائی ۱۹۱۹ء میں مراد آباد اور بجنور کی سرحد پر واقع ایک گاؤں امری میں پیدا ہوئے، یہ اور مشہور شاعر اختر الایمان گہرے دوست تھے اور فتح پوری ہائی اسکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے اور دونوں اسکول کے مشہور ڈبیٹر اور بہترین مقرر تھے، بی اے کرنے کے بعد خورشید الاسلام صاحب کچھ عرصے رسالہ "آج کل" کے سب اڈیٹر رہے اور ۱۹۴۳ء میں ایم اے کرنے کے لیے علی گڑہ مسلم یونی ورسٹی آئے، یہاں پھر اختر الایمان کا ساتھ ہوا اور دونوں ۱۹۴۴ء میں یونی ورسٹی کی نمایندگی کے لیے حیدر آباد گئے اور ہفت روزہ اردو کانگریس میں شریک ہوئے، خورشید الاسلام صاحب ۱۹۴۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر ہوگئے اور ۱۹۷۳ء میں پروفیسر ہوئے،

اور جب پروفیسر آل احمد سرور سبک دوش ہوئے تو یہ صدر شعبہ ہوئے۔

مضمون نگاری شروع کی تو مولانا شبلی پر ہاتھ صاف کیا، مولانا پر ان کا یہ مضمون ان کی کتاب "تنقیدیں" میں شامل ہے، اس کا آغاز اس طرح کیا ہے "شبلی پہلے یونانی تھے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے"، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مضمون ان کی علمی شہرت کا باعث بنا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کو بہت پسند کیا، ان کی سفارش پر خورشید صاحب کو لندن یونی ورسٹی میں ملازمت مل گئی مگر راقم نے سنا ہے کہ مولانا نے ان کے نام ہی کو غلط قرار دیا کہ اس میں مضاف و مضاف الیہ دولسانی ہیں۔

بہر حال وہ لندن یونی ورسٹی میں تدریسی خدمت پر مامور رہے اور آکسفورڈ یونی ورسٹی سے شائع ہونے والی اردو انگریزی لغت کے اڈیٹر بھی مقرر ہوئے، انہوں نے یونیسکو پروجیکٹ کے تحت "غالب - حیات اور خطوط" پر کام کیا، علی گڑھ کے علمی و تحقیقی مجلہ "فکر و نظر" کے مدیر بھی رہے۔

خورشید الاسلام صاحب اچھے استاد، اچھے نثر نگار و ناقد کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری بھی پر کشش ہے، تین شعری مجموعے چھپ گئے ہیں، رگ جاں، خستہ اور شاخ نہال غم، عصری حیثیت کی حامل ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

رات بھی ہے کچھ سونی سونی، دن بھی کچھ ویران سا ہے — پھول بھی ہیں کچھ سہمے سہمے، باغ بھی کچھ حیران سا ہے

قریہ قریہ اوج پہ سر ہیں، نوک سناں سر سبز بھی ہے — خنجر جھمکیں لعل سے گویا، گردن پر احسان سا ہے

دن سے جو بھی رات ملی ہے، گریہ کہ دیوار سی ہے — رات سے جو بھی دن پایا ہے، نوح کا طوفان سا ہے

بستی بستی آگ لگے اور گلیوں گلیوں خون بہے — قدرت کا یہ کھیل نہیں ہے، قدرت کا فرمان سا ہے

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

مولانا محمد عارف سنبھلی

دارالعلوم ندوۃ العلما کے تفسیر و عقائد کے استاد مولانا محمد عارف سنبھلی ۹ر جون ۲۰۰۶ء کو جمعہ کے دن دفعتاً وفات پاگئے، فجر کی نماز اور ضرورتوں سے فارغ ہونے کے بعد یکایک ان پر کپکپی طاری ہوئی، گھر والوں سے کچھ اڑھانے کے لیے کہا مگر چند ہی سکنڈ میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ عرصے سے ندوۃ العلما میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، اس سے پہلے دوسرے مدارس سے وابستہ تھے، ایک زمانے میں جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے منسلک تھے اور دارالمصنفین کے کتب خانے سے استفادے کے لیے مولوی حبیب اللہ رانچوی ندوی کے ساتھ یہاں آتے اور لوگوں سے ملنے جلنے کے بجائے سارا وقت مطالعہ میں گزارتے، مولوی حبیب اللہ سے میرا تعلق پرانا تھا ان ہی کے ساتھ میرے پاس آجاتے مگر وہ کم آمیز تھے اس لیے زیادہ کھل کر باتیں نہیں کرتے، ندوہ میں تو بڑی چہل پہل تھی مگر وہاں بھی کسی سے بہت بے تکلف نہیں دیکھا، عصر بعد مولانا علی میاں کی مجلس میں ضرور شریک رہتے مگر دوسروں کی طرح بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کرتے خاموشی سے بیٹھے رہتے۔

مولانا عارف صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، قرآنیات، کلام و عقائد سے شغف تھا، تفسیر و قرآنیات سے مناسبت کی بنا پر اتر پردیش اردو اکادمی نے مولانا عبدالماجد سمینار کے ان مقالات کی ایڈیٹنگ ان کو سپرد کی تھی جو مولانا کی تفسیر پر تھے، ان میں میرا بھی مضمون تھا، اتفاق سے میں ندوہ گیا تو مجھ کو اپنے گھر لوا گئے اور کہنے لگے کہ آپ کا مضمون مجھے بہت پسند ہے اور میں چاہتا ہوں کہ پورا چھپے مگر اکادمی کے ذمہ داروں کا اصرار ہے کہ یہ طویل ہے، آپ آگئے ہیں تو اس میں کچھ کمی کردیں، میں نے کہا مولانا مجھے اتنا موقع نہیں ہے آپ بے تکلف کمی بیشی کردیں، مجھے بالکل ناگواری نہیں ہوگی۔

مولانا محمد عارف مولانا محمد منظور نعمانی کے بھتیجے اور ان کے ساختہ پرداختہ تھے، اس لیے وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، توحید خالص میں کسی قسم کا کھوٹ اور اس میں ذرا بھی شرک و بدعت کی آمیزش پسند نہیں کرتے تھے، اسی بنا پر اس معاملے میں کوتاہ اور غیر محتاط لوگوں سے وہ بحث و مناظرہ کرتے، ان کے رد میں کتابیں لکھتے، اس سے متعلق ان کے مضامین "الفرقان" میں چھپتے، مولانا اچھے خطیب تھے، دینی جلسوں میں برابر شریک ہوتے، ان میں عقائد حقہ کو بڑے موثر اور دل نشین انداز میں پیش کرتے، ان کی تقریر بہت پسند کی جاتی تھی، اپنے علم و فضل اور اچھے طریقہ درس کی بنا پر طلبہ میں بھی محبوب تھے۔

مولانا محمد عارف کا مزاج خالص علمی تھا، وہ صرف پڑھنے لکھنے سے سروکار رکھتے تھے، بڑے متواضع اور قانع تھے، بہت سادہ زندگی بسر کرتے، کھانے اور پہننے میں کوئی خاص اہتمام نہ کرتے، ہر قسم کے تکلف سے بری تھے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کے درجات بلند کرے اور ان کے اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

"ض"

☆☆☆☆☆☆

مطبوعات جدیدہ

فرید الدین گنج شکر کے سال وصال کی تحقیق: از جناب فیروز الدین احمد فریدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۷۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: فاطمہ پبلی کیشنز، کھتوال ہاؤس ۸-۵۴، اسٹریٹ -۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی، پاکستان۔

خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے سال وصال کی تحقیق میں اس کتاب کے فاضل مصنف کے کئی مضامین جب معارف میں شائع ہوئے تو ان کی محنت، جستجو اور مراجع و مآخذ سے اخذ و استناد کی صلاحیت کو قدر کی نظر سے دیکھا گیا، اب زیر نظر کتاب میں انہوں نے تفصیل اور سلیقے سے ان سوالوں کے جواب تلاش کیے ہیں کہ خواجہ گنج شکر کے سال وصال ۶۶۴ھ کو کن تذکرہ نگاروں نے اختیار کیا؟ ان کے مآخذ کیا ہیں، یہ صحیح ہے یا نادرست؟ ۶۶۴ھ کے علاوہ اور تاریخوں کا پایہ استناد کیا ہے اور تحقیق کی رو سے اصل سن وفات کیا ہے؟ اس دیدہ ریزی بلکہ جاں کاہی کی وجہ بھی معقول ہے کہ بعض نامور اور مستند اہل قلم حضرات مثلاً خلیق احمد نظامی، نثار احمد فاروقی، شیخ محمد اکرام، سید صباح الدین عبدالرحمٰن بلکہ ان سے بہت پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دارا شکوہ وغیرہ سے بھی سال وصال ۶۶۴ھ ہی منسوب ہے، اس لیے اس کے مستند ہونے میں عام قاری کو شبہ بھی نہیں رہتا لیکن ان مصنفین خصوصاً پروفیسر نظامی کی ہی اور تحریروں سے اس میں تضاد بھی ظاہر ہے اور افسوس ہے کہ یہ تضاد ان کی نظر سے مخفی رہا اور یہ تضاد اس وقت اور سنگین ہو گیا جب بعض تذکرہ نگاروں نے ۶۶۰ھ سے ۶۷۰ھ تک مختلف سنین کا ذکر کر دیا، فاضل مصنف نے ہر روایت کو نقل کیا، شرح وبسط سے اس کا تجزیہ کیا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ سال وفات ۶۷۰ھ ہے (ص ۱۱۸)، اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی تقریظ میں یہ الفاظ قابل ذکر ہیں کہ "اولیاء اللہ سے ہماری عقیدت اور محبت مسلم لیکن ہم نے ان کے سوانح اور حالات قلم بند کرنے میں مورخانہ دیانت، جرح و تعدیل اور حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا، سارا زور کرامتوں کے زنجیرے بنانے میں صرف کیا"، فاضل مصنف نے اس کمی کی تلافی کی کوشش جس عرق ریزی سے کی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، البتہ اس تفصیل میں طوالت اور اطناب بھی شامل ہے، بحث کی اہمیت اس کی وجہ ہو سکتی ہے لیکن اختصار اور جامعیت کی گنجائش بہر حال تھی،،

خواجہ گنج شکر کے سال وصال کی طرح خواجہ نظام الدین اولیا کا سن ولادت بھی مختلف فیہ ہے، ضمناً اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ ۶۳۷ھ ہی صحیح سن ولادت ہے، آخر میں خواجہ گنج شکر کے حالات پر ایک پر اثر تحریر بھی ہے جس میں عقیدت کا وہی جذبہ غالب ہے جس کا شکوہ اسلم فرخی نے کیا، مثلاً اجودھن کی خانقاہ کو علم، عقل اور عشق کی بین الاقوامی یونی ورسٹی قرار دینا اور یہ کہنا کہ "اس کی بنیادیں کعبہ مشرفہ کی طرح انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں رکھی گئیں"، لیکن یہ بھی درست ہے کہ یہ کتاب فاضل مصنف کے لیے باعث افتخار ہے، ایسے کارنامے محبت ہی سے انجام دیے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ "فریدی نے فرید کی محبت کا حق ادا کر دیا"۔

تذکرۂ شیخ: مرتبہ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۳۶۰، قیمت: ۸۰ روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، نیا گاؤں ویسٹ، لکھنؤ۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی وفات کے بعد جن رسائل نے ان کی یاد میں خاص شمارے شائع کیے ان میں رسالہ "الفرقان" کے مضامین بلند پائیگی، تنوع اور جامعیت کے لحاظ سے نمایاں ہیں، زیر نظر کتاب میں ان کو اور بہتر طریقے سے یکجا کر کے ان کی افادیت کی توسیع کر دی گئی ہے، مختلف عنوانوں اور ابواب میں سوانح حیات، خاندان اور ذاتی صفات و کمالات، علوم دینیہ اور بالخصوص علم حدیث میں حضرت شیخ کی تالیفات اور ارشاد و اصلاح کی تفصیلات ہیں، ملفوظات و مکتوبات بھی ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد اشرف سلیمانی، مولانا نسیم احمد فریدی، قاضی زین العابدین سجاد، مولانا افتخار احمد فریدی رحمہم اللہ کے مضامین اور مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا تقی الدین مظاہری ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں اور مولانا فرید الوحیدی جیسے نامور اہل قلم کے مقالات نے حضرت شیخ کی زندگی سے عقیدت و شغف رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کو حد درجہ مفید و موثر بنا دیا ہے، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کا مضمون تحقیق کے اعلا معیار پر ہے، حضرت شیخ کے نسب نامے کے متعلق بعض مشہور روایتوں کو انہوں نے بے اصل قرار دیا ہے، مشہور شجرہ نسب کی ترتیب کو انہوں نے صحیح نہیں مانا ہے اور پھر تمہیداً یہ کہا کہ معروف شجرے کے صحیح نہ ہونے کی وجوہات اُر خاندان کو کچھ اور نسب ناموں سے وابستہ کرنے کی کوشش پر یہ مضمون تیار کیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی ژرف نگاہی کا عمدہ نمونہ بن گیا ہے، فاضل مرتب

نے پیش لفظ میں حضرت شیخ کی جامعیت اور صفت اعتدال کا ذکر خاص طور پر کیا ہے، اس امتیازی وصف کے مشاہدے کی سعادت بھی ان کو ملی لیکن اس وصف کی "چوٹ دل پر لگنا" سمجھ میں نہیں آیا۔

آئینہ معنی نما (ولی اورنگ آبادی - بعض حقائق): از جناب اسلم مرزا، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات: ۱۴۵، قیمت: ۷۵ روپے، پتہ: نوائے دکن پبلی کیشنز "بیت العنکبوت" پلاٹ نمبر ۷، روبرو دبستان گلشن ہال، مجنوں پل، رشید پورہ، اورنگ آباد دکن، مہاراشٹر۔

تاریخ اور زبان میں تحقیق، جوابی تحقیق بلکہ تحقیق مزید، دل چسپی، لطف اور افادیت کا اکثر باعث ہوتی ہے، زیر نظر کتاب اسی حقیقت کی شاہد ہے، ولی اورنگ آبادی، بابائے ریختہ ہیں، ولی دکنی اور بعض محققین کے بقول وہ ولی گجراتی ہیں، چند سال پہلے ان کی شخصیت پر آغا مرزا بیگ کی ایک کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی تو اس کے بعض بیانات اور مشمولات جیسے جولاں گری کی وضاحت، ولی کا سن ولادت، آصف جاہ اول اور ناصر جنگ شہید کی جنگ اور قلعہ ستارہ کی فتح میں ولی کی شرکت وغیرہ موضوعات اور محققین کے لیے صرف نئے ہی نہیں انوکھے بھی ثابت ہوئے، اس کے علاوہ ولی کے بعض اشعار کی تشریح اور ترجمانی بھی محل نظر قرار پائی، اس کتاب کے لائق مصنف پیشے سے وکیل ہیں لیکن علمی کاموں سے بھی وابستہ ہیں "معارف" اور دوسرے ادبی رسالوں میں بھی ان کی بعض تحریریں شائع ہو چکی ہیں جن سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی شعور اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ وکالت و تحقیق کے امتزاج کا عمدہ نمونہ یہ کتاب بھی ہے جس میں انہوں نے آغا مرزا بیگ کے مطالعہ اور نتائج مطالعہ کے اغلاط کی نشان دہی کی اور ان کے دعووں کا رد بڑی خوبی سے کیا ہے، آغا صاحب نے جولاں گری کو جولاہہ نگری، ستارا کو ستارہ، کتے کی سڑک کو کٹی گھاٹی کی سڑک قرار دیا، ولی کے ایک شعر میں پروانہ کے لفظ کو ذو معنی بتا کر اس سے ضیاء الدین پروانہ کی شخصیت مراد لی، حالاں کہ جس موقع پر یہ شعر کہا گیا اس وقت پروانہ صرف چھ سال کے تھے، اس طرح کے اور تاریخی اغلاط بھی آغا صاحب سے سرزد ہوئے لیکن ان کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اس بہانے دکنی اردو اور تاریخ دکن کے کئی دل چسپ اور مستند پہلو اس کتاب کے ذریعے تازہ ہو گئے، لائق مصنف کا طرز استدلال قابل داد ہے لیکن تنقید کے باب میں لب ولہجہ اور شائستہ ہونا چاہیے تھا، آغا مرزا کی قیاسی قلابازی، "یہ تحقیق ہے یا کذب و دروغ کا پلندہ"،

"قیاسی گھوڑے دوڑانا" وغیرہ مناسب اسلوب نہیں لیکن ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ "اگر ہم ادب و تاریخ کے بہترین قاری نہ ہوں تو ادب و تاریخ کے بہتر نقاد اور محقق نہیں ہو سکتے"، مصنف مشہور محقق اور دار المصنفین کے رفیق اعزازی عبدالرزاق قریشی مرحوم کے شاگرد ہیں اور استاد مرحوم کا یہ قول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے کہ "تحقیق نامعلوم حقائق کی تلاش اور معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصدیق ہے"، یہ کتاب اسی قول کا بہترین عکس ہے۔

ہندوستانی مسلمان، رویہ اور رجحان انیسویں صدی میں: از ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم، مرتبہ جناب شاہ عبدالسلام، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات: ۸۰، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی و دانش محل لکھنؤ۔

موجودہ دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا تجزیہ اور ان کے حل کی کوشش، گزشتہ زمانے کے حالات کے پس منظر میں شاید زیادہ مفید اور بارآور ہو، پروفیسر مشیر الحق مرحوم کی فکر میں جدت تھی، پامال راہوں کے وہ زیادہ قائل نہیں تھے، نظریے اور تجزیے میں خود ان کا ایک خاص نقطہ نظر تھا، اس مختصر لیکن اہم کتاب میں بھی ان کا یہی معروضی رنگ نمایاں ہے، جس میں انہوں نے انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم و تہذیب، مسیحی مبلغین، ایسٹ انڈیا کمپنی اور مسلمانوں کے رویہ اور رجحان پر خیالات کا اظہار کیا ہے، انگریزوں کے ابتدائی عہد میں ہندوستان کی شرعی حیثیت پر خاص بحث ہوئی تھی، اس کی اصل حقیقت کی تلاش بھی ایک مضمون میں کی گئی ہے، یہ بات تو مشہور ہے کہ مسلمان شروع سے انگریز اور ان کے ذریعہ روشناس کرائی گئی ہر نئی چیز کے مخالف تھے، پروفیسر مرحوم کی نظر میں یہ اس لیے غلط ہے کہ عموماً انیسویں صدی کے واقعات کا مطالعہ ایک اکائی کی شکل میں کیا جاتا ہے جبکہ ان کے بقول "انیسویں صدی کے اوائل اور اواخر میں زمین آسمان کا فرق ہے" اسی طرح یہ کہنا کہ "انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظرے ہونے لگے تھے جس کی ایک مثال شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور مناظرے ہیں"، پروفیسر مرحوم کے خیال میں یہ درست نہیں بلکہ واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کے عہد تک مناظرہ اپنے صحیح مفہوم میں رائج بھی نہیں ہوا تھا، اسی طرح ان کے مطابق یہ خیال بھی درست نہیں کہ علما کے زیر اثر مسلمانوں نے مغربی علوم اور انگریزی زبان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ مفروضہ بھی غلط

ہے کہ اس وقت علما نے مسلمانوں کو نئے زمانے کے استقبال سے روکا تھا، یہ مباحث اور نظریات نازک بھی ہیں اور نظری اختلافات کے امکانات کے حامل بھی ہیں اس لیے پروفیسر مرحوم کے نقطہ نظر سے اختلاف کی گنجائش بہر حال ہے لیکن اس کتاب کے فاضل مرتب کی یہ رائے بھی درست ہے کہ یہ مباحث غور و فکر کے قابل ضرور ہیں۔

عظمت کے نشان: از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۹۶، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج، اعظم گڈھ۔

اس مجموعہ مضامین کے مولف اب علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، متعدد عمدہ کتابوں کے مصنف اور ہندو پاک کے ممتاز رسائل کے صفحات پر قابل قدر مضامین نے ان کی شناخت ہی نہیں ان کے مقام کو بھی متعین کر دیا ہے، علامہ شبلی کے متعلق ان کی تحریریں خاصی ہیں لیکن انہوں نے اپنی اور پسندیدہ شخصیتوں کے حالات و خدمات کا تعارف جاری رکھا، رسائل و جرائد میں یہ مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، اب ان سب کو انہوں نے زیر نظر کتاب میں یکجا کر دیا ہے، سر سید و شبلی اور سلیمان و فراہی سے اکبر رحمانی تک قریب ۲۳ شخصیتوں پر یہ تحریریں محض شخصی تاثر تک محدود نہیں، سر سید اور علم تاریخ، علامہ شبلی علی گڑھ میں، تصانیف شبلی و سلیمان و عبد السلام ندوی کی تصنیفات و تراجم، مولانا آزاد کی تاریخی بصیرت، مولانا علی میاں کی مورخانہ عظمت، مولانا امین احسن اصلاحی کا اسلوب نگارش، ڈاکٹر حمید اللہ اور قانون بین الممالک جیسے مضامین بہترین علمی جائزے ہیں، مجنوں گورکھپوری اور شکیل بدایونی پر مضامین خود لائق مصنف کے اعلا ادبی ذوق کے غماز ہیں، مولانا آزاد کی تاریخی بصیرت میں انہوں نے حواشی ابوالکلام کی روشنی میں مولانا آزاد کے حواشی کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ اگرچہ ان سے دارا شکوہ کی طرف داری صاف ظاہر ہے لیکن عالم گیر کی کردار کشی میں انگریز مورخوں اور سیاحوں کے بارے میں مولانا آزاد کا یہ خیال بھی نقل کر دیا ہے کہ انگریز مورخوں نے عالم گیر کی فرضی تصویر کھینچی ہے اور یہ ان کے قلمی فریبوں کی فہرست میں ہمیشہ نمایاں رہے گی، اعتدال و توازن کا یہی جوہر ان کی تحریر کا خاصہ ہے، مدیر معارف نے اس کے علاوہ پختگی اور دل کشی کی داد بھی دی ہے، ان کی اور مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کی تعارفی تحریروں سے مزین عظمت کے نشاں واقعی دل کش اور روشن ہیں۔

ع-ص

☆☆☆☆☆